جلد ۸۰ فروری سنہ ۱۹۷۴ء عدد ۶

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

ابوالاعلیٰ مودودی

ادارۂ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

جلد ۸۰	فروری ۱۹۷۴ء مطابق محرم الحرام ۱۳۹۴ھ	عدد ۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵ - اے ذیلدار پارک۔ اچھرہ۔ لاہور

زرِ سالانہ دس روپیہ ——— فی پرچہ ایک روپیہ

ابو الخیر مودودی پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: محمد شفیع

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

ترجمان القرآن کے گزشتہ چند شماروں کے اشارات دیکھنے کے بعد ایک صاحبِ علم نے خاکسار کو ایک خط ارسال کیا ہے جس کا لب لباب یہ ہے کہ ماضی میں تو خیر جو ہوا سو ہوا۔ عوام جھوٹے وعدوں اور خوش کن نعروں کے فریب میں آکر ایک غلط فیصلہ کر بیٹھے مگر اصلاحِ حال کی اب کیا صورت ہونی چاہیے کہ اقتدار غلط ہاتھوں سے نکل کر اچھے ہاتھوں میں منتقل ہو سکے اور قوم جس مصیبت میں مبتلا ہو چکی ہے وہ اس سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے

اس خط کے اندر موجودہ حالات کے بارے میں جس کرب و اضطراب اور اس سے نجات پانے کے لیے جس خواہش کا اظہار کیا گیا ہے وہ ہر حساس شخص کی قلبی کیفیت کا مظہر ہے۔ اہلِ بصیرت تو ایک طرف رہے معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والے افراد بھی حال اور مستقبل کے بارے میں سخت پریشان نظر آتے ہیں اور یوں محسوس کر رہے ہیں کہ جس کشتی میں وہ سوار ہیں اس میں سوراخ ہو چکا ہے اور پانی تیزی کے ساتھ اندر داخل ہو رہا ہے مگر اس کے ناخدا انہیں یہی باور کرا رہے ہیں کہ سوراخ بند کرنے اور پانی نکالنے کے سارے انتظامات مکمل ہو چکے ہیں۔ کشتی ابھی ساحلِ مراد پر پہنچ کر لنگر انداز ہوا چاہتی ہے۔ کشتی میں سوراخ، اس کے اندر پانی داخل ہوتے اور اس کے ڈوبنے کے خدشات کا ذکر دشمنوں کا جھوٹا پراپگنڈا ہے۔ معمولی سے خطرے کو جس سے موجودہ حکمران طبقہ بخوبی نمٹ سکتا ہے کو خواہ مخواہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جا رہا ہے۔

اس ملک میں جو لوگ واقعی "پس چہ باید کرد" کا صحیح جواب چاہتے ہیں تو انہیں چند باتوں پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے کیونکہ ان پر غور کیے بغیر کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ممکن نہیں، اور اس غور و فکر ہی میں انہیں اس بات کا جواب بھی مل سکتا ہے کہ ہم ماضی کے واقعات کو قوم کے سامنے بار بار دُہرا کر سانپ گزر جانے کے بعد لکیر پیٹنے کی غلطی نہیں کر رہے بلکہ ہم یہ فرض اس غرض سے انجام دے رہے ہیں کہ قوم کو متنبہ کر سکیں کہ سانپ بار بار

مختلف روپ دھار کر اسی لکیر پر سے گزرتا رہتا ہے جس کی اسے فکر کرنی چاہیے۔

آپ ذرا اس بات پر غور کریں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہماری قوم عام حالات میں ہر معقول بات سنتی بھی ہے اور معقولیت کے ساتھ اس پر غور بھی کرتی ہے۔ عمل کے اعتبار سے اگرچہ اس میں کئی ایک کوتاہیاں پائی جاتی ہیں لیکن اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسے اسلام کے ساتھ کسی حد تک وابستگی بھی ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے آخر ہر فیصلہ کُن مرحلے پر یہ کیوں کسی ہیجانی کیفیت میں گرفتار ہو کر ایک ایسا قدم اُٹھا دیتی ہے جو اُسے اس کی اصل منزل کی طرف لے جانے کی بجائے اسے بالکل مخالف سمت میں لے جاتا ہے اور وہاں پہنچ کر جب اس پر حقیقت عیاں ہوتی ہے تو پھر کفِ افسوس ملنا شروع کر دیتی ہے۔ اس کے بہی خواہ بوں توں کرکے پھر اسے راہ راست پر لانے کے لیے آگے بڑھتے ہیں اور یہ چند قدم اُن کی رہنمائی میں صحیح سمت پر اُٹھاتی بھی ہے، لیکن جب اس راہ پر اس کے سامنے پھر فیصلہ کن قدم اٹھانے کا مرحلہ آتا ہے تو یہ اسی غلطی کا ارتکاب کرتی ہے جس کا ارتکاب کرکے اس نے پہلے غیر معمولی نقصان اٹھایا تھا۔

دُور نہ جائیے ہندوستان میں انگریز کے تسلط کے بعد کے واقعات پر نظر دوڑایئے تو آپ کو اس حقیقت کا بخوبی اندازہ ہو سکے گا۔ انگریز نے جس وقت اس سرزمین پر قدم رکھا اسی وقت اصحاب بصیرت نے اس خطرے کو اچھی طرح بھانپ لیا تھا کہ انگریز کی یلغار سے نہ صرف مسلمان سیاسی حیثیت سے غلام ہوں گے بلکہ انہیں ذہنی غلامی میں مبتلا کرنے کی بھی پوری کوشش کی جائے گی، کیونکہ جب تک کوئی قوم ذہنی لحاظ سے کسی حاکم قوم کی غلام نہیں بنتی اس وقت تک حاکم قوم کا سیاسی تسلط دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ مسلمانوں کے بہی خواہوں نے جہاں انگریز کا سیاسی تسلط توڑنے کی کوشش کی وہاں مسلم قوم کو ذہنی غلامی سے بچانے کے لیے بھی نہایت مؤثر تدابیر اختیار کیں، جن میں سب سے کارگر تدبیر یہ تھی کہ دینی تعلیم کو عام کیا جائے اور انگریزی تہذیب و ثقافت سے جہاں تک ہو سکے نوخیز نسلوں کو بچایا جائے۔ مگر قوم کی ایک اچھی خاصی تعداد نے دُنیوی لالچ میں آکر اُن لوگوں کا ساتھ دیا جو نوجوانوں کو مغربی تہذیب میں رنگنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان تہذیبی یلغار کی زد میں آکر خود اعتمادی کھو بیٹھے۔ انہیں اپنی تہذیب اور اپنے تمدن پر کوئی بھروسہ نہ رہا اور انہوں نے اپنی اور آیندہ نسلوں کی بہتری اسی میں سمجھی کہ مغربی افکار، مغربی آداب اور مغربی معاشرت کو اپنا کر انگریز کے ہاں رسوخ حاصل کر لیا جائے۔ جن لوگوں نے مسلمانوں کے اندر اس خطرناک رُجحان کے پرورش پانے کی مخالفت کی اوّلاً انہیں عقل

کی بات سمجھانے کی کوشش کی کہ دنیا کی ہر تہذیب اپنی الگ فکری اساس اور نظامِ اقدار رکھتی ہے، جسے اپنا کر نہ صرف قوموں کے فکر و نظر کے زاویے بدل جاتے ہیں بلکہ خیر و شر کے معیارات بھی تبدیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس لیے اگر مسلمانوں کو بحیثیت مسلمان زندہ رہنا ہے تو انہیں اپنی تہذیب ترک کر کے ایک ایسی تہذیب کو اختیار نہ کرنا چاہیے جو اسلامی تہذیب کی عین ضد ہے، مگر انہیں ملت کا بدخواہ سمجھ کر ان کے خلاف جنگ شروع کی گئی اور ان کے بارے میں عوام کو یہ تاثر دیا گیا کہ یہ لوگ بد اندیش ہیں اور ملت کو دنیوی فوائد سے محروم رکھنے پر بضد ہیں۔

مغربی تہذیب کو اپنانے کا جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سب کے سامنے ہے کہ مسلم قوم کے جسد سے ایسے کئی اجزا الگ ہونے لگے جو شکل و صورت کے اعتبار سے تو ہندوستانی تھے مگر عادات، معاشرت، اندازِ فکر اور جذبہ و احساس کے اعتبار سے پورے صاحب بہادر اور غیر ملکی آقاؤں کے مفادات کے اہلِ فرنگ سے زیادہ خیرخواہ اور محافظ تھے۔ اس طبقے سے انگریز کو اس ملک میں اپنے پنجے گاڑنے میں غیر معمولی مدد حاصل ہوئی اور اسلامی تہذیب اور اسلامی نظامِ حیات جو اس کے ظالمانہ نظام کے خلاف ایک چیلنج بن سکتا تھا اس میں اضمحلال پیدا ہوا۔ اس کے علاوہ مسلم معاشرے میں سے اُسے اچھی خاصی تعداد میں ایسے مردانِ کار بھی ہاتھ آئے جو خدا اور اس کے احکام کو پس پشت ڈال کر مادی مفادات کی پرستش پر راضی ہو گئے۔ نتیجۃً قوم کے اندر ہزاروں کی تعداد میں جعفر و صادق پیدا ہونے لگے جنہوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ملت کا شیرازہ منتشر کر کے رکھ دیا۔

کسی حکمران جماعت کے لیے اس سے بڑی کامیابی اور کوئی نہیں ہو سکتی کہ وہ اپنے مخالفین میں سے ایسے اہلِ غرض پیدا کرلے جو دنیوی مفادات کی خاطر اپنے بھائی بندوں کو چھوڑ کر اس کے ساتھ آ شامل ہوں اور پھر اس کا اشارہ پا کر بھائی بندوں کا گلا کاٹنے سے بھی گریز نہ کریں۔ مسلم قوم میں جب اس قسم کے مفاد پرستوں نے جنم لینا شروع کیا اور معاشرے نے بھی ان کی پذیرائی کی تو پھر ضمیر فروشی کا کاروبار خوب چمکا اور بڑی قلیل مدت ہی میں یہ قوم خوفناک قسم کے انتشار کا شکار ہو کر رہ گئی۔

فلسفہ تاریخ کے ایک نامور مفکر سے کسی شخص نے سوال کیا کہ قومیں کس طرح برباد ہوتی ہیں تو اس نے جواب میں کہا ذہنی غلامی اور مفاد پرستی سے۔ ذہنی غلامی سے قوم کی خود اعتمادی کو دھچکا لگتا ہے اور راہ بے کھو دینے سے وہ اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کرنے لگتی ہے اور تحفظ کے لیے اپنے آپ کو دوسروں کا محتاج اور دست نگر

پاتی ہے۔ یہی کیفیت اس کے افراد میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ مفاد پرستی کے جنون میں اپنے ضمیر، ایمان، اخلاق کا سودا کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ جب یہ صورتِ حال معرض وجود میں آجائے تو ہر وہ گروہ جو دُنیوی مفادات فراہم کرنے کی پوزیشن میں ہوتا ہے وہ اس پر بڑی آسانی سے اپنی خدائی قائم کر سکتا ہے۔ پھر تاریخ کا یہ بھی ایک عظیم المیہ ہے کہ مفاد پرستی سے انسان کا ضمیر ہی برباد نہیں ہوتا بلکہ اخلاق بھی تباہ ہو جاتا ہے کیونکہ مفاد پرستی اسے سب سے پہلے نشاط کاری میں مبتلا کرتی ہے جہاں سے وہ لطف اندوزی کے چکر میں پڑتا ہے اور پھر جلد ہی معصیت کوشی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔

مفاد پرستی کے اس روگ نے مسلمانوں کو آج تک سنبھلنے نہیں دیا۔ اس قوم کے غمگسار بار بار اسے سنبھالا دینے کی کوشش کرتے ہیں مگر مفاد پرستوں کا ٹولہ اُن کے عزائم کو ہر بار ناکام بنا کر رکھ دیتا ہے۔ تحریکِ خلافت، تحریکِ احرار، خاکسار تحریک سب ملت کو سنبھالا دینے کی متعدد کوششوں کے مختلف مظاہر ہیں اور ان سب کے پیچھے یہی جذبہ کارفرما رہا ہے کہ کسی طرح مسلمان اپنے کھوئے ہوئے وقار کو بحال کر سکیں۔ مگر یہ ساری تحریکات مفاد پرستوں کی تخریبی کارروائیوں کی نذر ہو کر رہ گئیں۔ خود مسلم لیگ کی تحریک جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت کی غیر معمولی حمایت حاصل رہی وہ بھی ان مفاد پرستوں کے ہاتھوں تباہ ہوئی اور وہ مقدس آرزو جس کی تکمیل کے لیے مسلمانانِ ہند نے ایک الگ خطۂ ارضی کا مطالبہ کیا تھا، وہ ایک حسرتِ ناکام کی حیثیت سے دل کے گوشوں ہی میں دفن ہو کر رہ گئی۔ مسلم لیگ کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب آخر اس کے علاوہ اور کیا ہے کہ وہ لوگ جو اس ملک میں انگریزی استعمار کے ایجنٹ تھے انہوں نے جب حالات کا رُخ بدلتے دیکھا اور انہیں اس بات کا پختہ یقین ہو گیا کہ اب دُنیوی مفادات کی کلید مسلم لیگ کے ہاتھ آنے والی ہے تو وہ جوق در جوق اس کی صفوں میں گھس کر اس کے بعض اہم مناصب پر قابض ہو گئے اور اس طرح قوم کی آنکھوں کا تارا بن گئے اور انگریز جب عنانِ اقتدار لیگ کے حوالے کر کے یہاں سے رخصت ہوا تو اس کے یہی نمک خوار جو اس کی خوشنودی کی خاطر پشت ہا پشت سے اپنی قوم کے خلاف صف آرا چلے آرہے تھے اور جن کے ہاتھ اس مظلوم قوم کے تازہ خون سے رنگین تھے، وہ راتوں رات فخرِ قوم، متاعِ ملت، شوکتِ اسلام اور دولتِ ارضِ پاکستان بن گئے اور مسلم لیگ کے غریب کارکن جن کی شب و روز کی محنت اور بے مثال جذبہ ایثار نے اس جماعت کو ایک فیصلہ کن مرحلے پر فعال جماعت بنا یا تھا، وہ نہ صرف گوشہ گمنامی میں چلے گئے بلکہ اس جماعت پر بوجھ سمجھے جانے لگے اور طاقت کا سرچشمہ یہ نئے قائدین قرار پائے جنہیں اپنی غداریوں اور ملت فروشانہ طرزِ عمل کی وجہ سے قوم کو

منہ دکھانے کی بھی جرأت نہ ہونی چاہیے تھی۔ اس کا جو نتیجہ نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔ جماعت جس کے ہاتھوں پاکستان معرضِ وجود میں آیا تھا وہ تعمیری صلاحیتوں سے یکسر محروم ہو کر مفاد پرستوں کا ٹولہ بن گئی جسے حکمران طبقہ جس طرح چاہتا اپنے اقتدار کے لیے استعمال کرتا۔

دُنیوی اغراض کا اشتراک اگرچہ چند لوگوں کو کچھ وقت کے لیے ایک جگہ جمع کر سکتا ہے مگر یہ اشتراک کسی پائیدار اتحاد کی بنیاد نہیں بن سکتا۔ یہی حال لیگ کا ہوا۔ جب تک ملک کی زمام کار مسلم لیگ کے ہاتھ میں رہی اس وقت تک مفاد پرست طوعاً کرہاً اس کے دامن سے چمٹے رہے، لیکن اغراض کے ان بندوں نے جب یہ دیکھا کہ اقتدار اب ان ہاتھوں میں منتقل ہو گیا ہے جو لیگ کو ختم کر دینے کا عزم رکھتے ہیں تو یہ طالع آزما چشم زدن میں اپنی وفاداریاں بدل کر ان لوگوں کے ساتھ جا شامل ہوئے جو مسندِ اقتدار پر قابض تھے۔ یہ مفاد پرست ٹولہ کبھی ری پبلکن پارٹی کے جھنڈے تلے جمع ہوا، کبھی عوامی لیگ میں جا گھسا اور کبھی فیلڈ مارشل محمد ایوب کی تشکیل کردہ کنونشن لیگ کے اندر شامل ہو کر مارشل صاحب کے حق میں زندہ باد کے نعرے بلند کرتا ہوا نظر آیا اور اب اس کی بہت بڑی تعداد پیپلز پارٹی کے اندر دکھائی دے رہی ہے۔ اس ٹولے کے جو ارکان اپنی "کوتاہ اندیشی" کی بنا پر اپنی وفاداریاں بروقت تبدیل کرنے میں ناکام رہے وہ اب تلافی مافات کی غرض سے کسی نہ کسی طرح برسرِ اقتدار گروہ خصوصاً قائدِ عوام کو اپنی نیازمندی کا یقین دلانے میں مصروف ہیں اور شاہ سے زیادہ شاہ کے وفادار بننے کی کوشش میں منہمک نظر آتے ہیں۔ ان لوگوں سے جب کبھی بھی گفتگو کا موقع ملا تو اُن کی باتوں سے یہی معلوم ہوا کہ انہیں نہ تو پیپلز پارٹی سے کوئی دلچسپی ہے، نہ اس کے منشور سے کوئی سروکار اور نہ قائدِ عوام سے ہی کوئی محبت اور عقیدت، اُنہیں تو بہر طور حزبِ اقتدار کے ساتھ ہی رہنا ہے کیونکہ ناجائز مراعات کے حصول کے لیے اور دُنیوی مفادات کے تحفظ کے لیے اُن کے نزدیک یہی ایک صحیح لائحہ عمل ہے۔

ہمارے ملک کے حساس اور سنجیدہ طبقے کو اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس ملک میں آخر کیوں سیاسی استحکام پیدا نہیں ہوتا اور ایک وقت میں وہ سیاسی جماعت جو اقتدار کی تائید کے ساتھ ملک کی سب سے بڑی سیاسی قوت دکھائی دیتی ہے اور جس کے سربراہوں کے بارے میں عوام کے ذہنوں میں یہ نقش بٹھایا جاتا ہے کہ تاریخ انسانی میں آج تک ان کے پایہ کا کوئی دوسرا مدبّر پیدا نہیں ہوا، وہ اقتدار کے تبدیل ہونے ہی راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جاتی ہے، اور اس کے قائدین جو مرتبہ و مقام کے اعتبار سے قطب صاحب کی لاٹ سے بھی زیادہ بلند دکھائی دیتے ہیں وہ یکایک

عوام کی نظروں سے گر کر گوشۂ تنہائی میں چلے جاتے ہیں اور قوم اور اس کے معاملات سے یکسر بے تعلق ہو کر زندگی بسر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کے اس طرزِ عمل کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے ہاں قوم اور وطن سے محبت اور اس کی خدمت کے لیے یہ بات انتہائی ضروری ہے کہ قوم ان ہی خواہوں کو پہلے مسندِ اقتدار پر براجمان کرے، پھر اُن سے خدمت کی توقع کرے اور قوم اگر انہیں اس شرف سے محروم کرتی ہے تو پھر اُسے ان سے کسی خیر اور اور بھلائی کی امید نہ کرنی چاہیے۔

اسی غلط ذہنیت کی وجہ سے اس ملک میں حزبِ اختلاف کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکی اور اسی بنا پر اس ملک کے رہنماؤں کو عوام کے اندر سیاسی بیداری اور سمجھ بوجھ پیدا کرنے کے بجائے ہمیشہ اس بات کی فکر دامنگیر رہتی ہے کہ کسی طرح تختِ اقتدار پر قبضہ کر لیا جائے کیونکہ ان کے نزدیک یہ وہ "سم سم" ہے جس سے مال و دولت، عزت و شرف، جاہ و جلال، قیادت و سیادت، الغرض دنیا کی ہر قیمتی متاع کے خزائن کھل جاتے ہیں اور صاحبِ اقتدار بلا روک ٹوک اس سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ اس لیے اُسے عوام کی فلاح و بہبود سے کہیں زیادہ دلچسپی مسندِ اقتدار سے ہوتی ہے اور وہ تمام جائز و ناجائز ہتھکنڈے استعمال کر کے سب سے پہلے اس ہما کو اپنے قبضے میں لینے کی کوشش کرتا ہے جس کے سائے تلے انسان کو تمام دُنیوی برکات حاصل ہو سکتی ہیں۔

موجودہ حکمران جماعت چالیس فیصد سے بھی کم ووٹ حاصل کر کے تختِ اقتدار پر متمکن ہوئی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ملک کی اکثریت اس جماعت کے حق میں نہ تھی۔ پھر برسرِ اقتدار گروہ کے "کارہائے نمایاں" بھی کچھ اس قسم کے ہیں کہ ان سے عوام کے اندر حزبِ اقتدار کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات میں کچھ اضافہ ہی ہوا ہے کسی قسم کی کمی نہیں ہوئی۔ ہر شخص کے چہرے پر بیزاری کے آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود حکمران طبقہ اپنی روش میں کوئی معمولی سی تبدیلی کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ بجز اس کے کیا ہے کہ ملک کی جن مؤثر شخصیتوں، جماعتوں اور گروہوں سے حکمرانوں کو کسی مخالفت کا خدشہ تھا ان میں سے ایک معقول تعداد دُنیوی مفادات کے لالچ میں اُن سے وابستہ ہو گئی ہے اور وہ اپنی عافیت اور اپنے مفادات کا تحفظ اسی میں دیکھتی ہے کہ جب تک موجودہ حکمران گروہ تختِ اقتدار پر قابض رہے اس وقت تک اس کی نیازمندی میں زندگی بسر کی جائے اور جب اس کی جگہ کوئی دوسرا گروہ اس پر مسلط ہو جائے تو پھر اُس کی چاکری اختیار کر لی جائے۔

لوگ شدتِ جذبات کے ساتھ طنزیہ لہجے میں یہ کہتے ہوئے سُنائی دیتے ہیں کہ کہاں ہیں وہ جماعتیں جو عوام کی محبت کا دم بھرتی تھیں وہ اب کیوں میدان میں اتر کر انہیں اس عذاب سے نجات نہیں دلاتیں؟ عوام کا غصہ اپنی جگہ بجا اور درست لیکن اگر یہ بات ناگوار نہ ہو تو ان جماعتوں کو بھی عوام سے یہ سوال کرنے کا حق حاصل ہے کہ آخر وہ ہر فیصلہ کن مرحلے پر غلط قدم اٹھانے پر ہی کیوں اصرار کرتے ہیں۔ کیا جو لوگ اس وقت مسندِ اقتدار پر قابض ہیں وہ نئے چہرے تھے جن کے بارے میں انہیں کچھ علم نہ تھا؟ کیا انہیں بروقت ان خطرات سے متنبہ نہ کیا گیا؟ کیا انہیں خوش کن نعروں کے پیچھے جو خطرناک عزائم چھپے ہوئے تھے ان کی حقیقت نہ بتائی گئی؟ مگر انہوں نے کسی بات کی طرف بھی توجہ نہ دی اور جس فرد یا گروہ نے بھی انہیں صحیح فیصلہ کرنے کا مشورہ دیا اس کی گالیوں سے تواضع کی۔ ہم یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ انسانیت کے حقیقی بہی خواہوں کو لوگوں کی گالیاں سن کر دل شکستہ نہ ہونا چاہیے اور ہر قسم کے نامساعد حالات میں خود بھی اور عوام کو بھی جادہ مستقیم پر گامزن رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ لیکن کیا عوام پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ جہاں وہ اپنی ذاتی زندگی میں بھلے اور بُرے کے درمیان تمیز کرتے ہیں وہاں وہ اجتماعی معاملات میں بھی اسی دانشمندی کا مظاہرہ کریں اور کسی فرد کو قیادت کا تاج سوچ سمجھ کر پہنائیں۔ جب تک عوام اپنے اس فرض کو پہچان کر اپنی قوت کو پوری جرأت کے ساتھ خیر اور بھلائی کے پلڑے میں ڈالنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اس وقت تک کسی صحت مند تبدیلی کا خواب، خواب ہی رہے گا شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکے گا۔

اس وقت بلاشبہ اقتدار کی تبدیلی کی خواہش عوام کے سینوں میں موجزن ہے مگر دیکھیے کہ کیا اس خواہش کے پیچھے وہ محرکات بھی موجود ہیں جن کی مدد سے کسی تصادم اور توڑ پھوڑ کے بغیر تبدیلی لائی جاسکتی ہے۔ کسی صحت مند تبدیلی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ عوام گھٹیا مقاصد کی خاطر نہیں بلکہ ارفع و اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی غرض سے انقلابِ قیادت کے خواہاں ہوں۔ اور وہ اس بات کے دل و جان سے متمنی ہوں کہ نئی قیادت برسرِ اقتدار آنے کے بعد نہ صرف ان کی روزمرہ کی مشکلات دُور کرے گی بلکہ انہیں ایک ایسا نظامِ حیات بھی عطا کرے گی جو اُن کی ملی آرزوؤں کا ہر لحاظ سے مظہر ہو۔ اور اپنی ذات کی برتری قائم کرنے کے بجائے اس نظام کے نفاذ کے لیے اپنی پوری قوت صرف کرے گی۔ جب تک تبدیلی کے محرکات گہرے اور معنی خیز نہ ہوں اس وقت تک اقتدار کے ہاتھوں کی تبدیلی کسی قوم کے لیے نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوسکتی۔

(بقیہ اشارات صفحہ ۴۸ پر)

دعوتِ حق کے لیے ہدایات

جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئیں

(۱)

خفیہ تبلیغ کے ابتدائی ۳ برسوں کا حال ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب دعوتِ عام کے ۱۰ سالہ مکی دور کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا ہی میں دو چیزیں اچھی طرح واضح کر دی جائیں جن سے بعد کے پیش آنے والے واقعات بہتر طور پر سمجھے جا سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو کارِ رسالت انجام دینے کے لیے کیا ہدایات دی گئی تھیں جو اتنی کارگر تھیں کہ اُنھوں نے دلوں اور روحوں کو مسخر کر کے چھوڑا، دماغوں کی ٹیڑھ نکال کر چھوڑی، اور ایک اُجڈ قوم کو بدل کر رکھ دیا۔

دوسرے یہ کہ اسلامی دعوت کی حقیقی نوعیت کیا تھی جس کی وجہ سے آپؐ کے خلاف عداوت کا وہ طوفان اُٹھا جو عرب میں محض شرک سے انکار اور توحید کا اقرار کرنے والوں کے خلاف کبھی نہ اُٹھا تھا، مگر یہ دعوت کیسی زبردست قوت کے ساتھ پیش کی گئی تھی کہ اس نے جاہلیت کے علم برداروں کو آخر کار بے بس کر دیا۔

اس باب میں ہم صرف پہلے موضوع سے بحث کریں گے اور دوسرے موضوع پر بعد کے باب اور اس کی فصلوں میں کلام کیا جائے گا۔

ابتدائے دعوت کے متعلق اجمالی بیان اللہ تعالیٰ نے عرب کے مشہور مرکزی شہر مکہ میں اپنے ایک بندے (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کو پیغمبری کی خدمت کے لیے منتخب کیا اور حکم دیا کہ اپنے شہر اور اپنے قبیلہ (قریش) سے دعوت کی ابتدا کریں۔ یہ کام شروع کرنے کے لیے آغاز میں جن ہدایات کی ضرورت تھی صرف وہی دی گئیں اور وہ زیادہ تر تین مضمونوں پر مشتمل تھیں۔

ایک، پیغمبر کو اس امر کی تعلیم کہ وہ خود اپنے آپ کو اس عظیم الشان کام کے لیے کس طرح تیار کریں اور کس

طرز پر کام کریں۔

دوسرے، حقیقتِ نفس الامری کے متعلق ابتدائی معلومات اور حقیقت کے بارے میں اُن غلط فہمیوں کی مُجمل تردید جو گرد و پیش کے لوگوں میں پائی جاتی تھیں، جن کی وجہ سے اُن کا رویّہ غلط ہو رہا تھا۔

تیسرے، صحیح رویّہ کی طرف دعوت اور ہدایتِ الٰہی کے اُن بنیادی اصولِ اخلاق کا بیان جن کی پیروی میں انسان کے لیے فلاح و سعادت ہے۔

شروع شروع کے یہ پیغامات ابتدائے دعوت کی مناسبت سے چند چھوٹے چھوٹے مختصر بولوں پر مشتمل ہوتے تھے، جن کی زبان نہایت شُستہ، نہایت شیریں اور نہایت پُر اثر اور مخاطب قوم کے مذاق کے مطابق بہترین ادبی رنگ لیے ہوئے ہوتی تھی، تاکہ دلوں میں یہ بول تیر و نشتر کی طرح پیوست ہو جائیں، کان خود بخود اُن کے ترنّم کی وجہ سے ان کی طرف متوجہ ہوں اور زبانیں ان کے حُسنِ تناسُب کی وجہ سے بے اختیار ہو کر انہیں دُہرانے لگیں۔ پھر ان میں مقامی رنگ بہت زیادہ تھا۔ اگرچہ بیان تو کی جارہی تھیں عالمگیر صداقتیں، مگر ان کے لیے دلائل و شواہد اور مثالیں اُس قریب ترین ماحول سے لی گئی تھیں جس سے مخاطب لوگ اچھی طرح مانوس تھے۔ اُنہی کی تاریخ، اُنہی کی روایات، اُنہی کے روزمرہ مشاہدے میں آنے والے آثار اور اُنہی کی اعتقادی و اخلاقی اور اجتماعی خرابیوں پر ساری گفتگو تھی تاکہ وہ اس سے اثر لے سکیں۔

دعوت کا یہ ابتدائی مرحلہ تقریباً چار پانچ سال تک جاری رہا (جن میں پہلے تین سال خفیہ دعوت کے تھے) اور اس مرحلے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ کا ردِعمل تین صورتوں میں ظاہر ہوا:

۱۔ چند صالح آدمی اِس دعوت کو قبول کر کے اُمتِ مسلمہ بننے کے لیے تیار ہو گئے۔

۲۔ ایک کثیر تعداد جہالت یا خود غرضی یا آبائی طریقے کی محبت کے سبب سے مخالفت پر آمادہ ہو گئی۔

۳۔ مکہ اور قریش کی حدود سے نکل کر اس نئی دعوت کی آواز نسبتاً زیادہ وسیع حلقے میں پہنچنے لگی۔

یہاں سے اس دعوت کا دوسرا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اس مرحلے میں اسلام کی اس تحریک اور پُرانی جاہلیت کے درمیان ایک سخت جان گسل کشمکش برپا ہوئی جس کا سلسلہ آٹھ نو سال تک چلتا رہا۔ نہ صرف مکے میں، نہ صرف قبیلۂ قریش میں، بلکہ عرب کے بیشتر حصوں میں بھی جو لوگ پُرانی جاہلیت کو برقرار رکھنا چاہتے تھے وہ اس تحریک کو بزور مٹا دینے پر تُل گئے۔ انہوں نے اسے دبانے کے لیے سارے حربے استعمال کر ڈالے۔ جھوٹا پروپیگنڈا کیا، الزامات اور شبہات اور اعتراضات کی بوچھاڑ کی، عوام الناس کے دلوں میں طرح طرح کی وسوسہ اندازیاں کیں، ناواقف

لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے سے روکنے کی کوششیں کیں، اسلام قبول کرنے والوں پر نہایت وحشیانہ ظلم وستم ڈھائے، ان کا معاشی اور معاشرتی مقاطعہ کیا، اور ان کو اتنا تنگ کیا کہ ان میں سے بہت سے لوگ دو دفعہ اپنے گھر چھوڑ کر حبش کی طرف ہجرت کر جانے پر مجبور ہوئے اور بالآخر تیسری مرتبہ ان سب کو مدینے کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ لیکن اس شدید اور روز افزوں مزاحمت کے باوجود یہ تحریک پھیلتی چلی گئی۔ مکے میں کوئی خاندان اور کوئی گھر ایسا نہ رہا جس کے کسی نہ کسی فرد نے اسلام قبول نہ کر لیا ہو۔ بیشتر مخالفین اسلام کی دشمنی میں شدت اور تلخی کی وجہ یہی تھی کہ ان کے اپنے بھائی، بھتیجے، بیٹے، داماد، بیٹیاں، بہنیں اور بہنوئی دعوتِ اسلام کے نہ صرف پیرو بلکہ جان نثار حامی ہو گئے تھے اور ان کے اپنے دل و جگر کے ٹکڑے ہی ان سے برسرِ پیکار ہونے کو تیار تھے۔ پھر لطف یہ ہے کہ جو لوگ پرانی جاہلیت سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس نو خیز تحریک کی طرف آ رہے تھے وہ پہلے بھی اپنی سوسائٹی کے بہترین لوگ سمجھے جاتے تھے، اور اس تحریک میں شامل ہونے کے بعد وہ اتنے نیک، اتنے راستباز اور اتنے پاکیزہ اخلاق کے انسان بن جاتے تھے کہ دنیا اُس دعوت کی برتری محسوس کیے بغیر رہ نہیں سکتی تھی جو ایسے لوگوں کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی اور انہیں یہ کچھ بنا رہی تھی۔

اِس طویل اور شدید کشمکش کے دوران میں اللہ تعالیٰ حسب موقع اور حسب ضرورت اپنے نبی پر ایسے پُرجوش خطبے نازل کرتا رہا جن میں دریا کی سی روانی، سیلاب کی سی قوت اور تیز و تُند آگ کی سی تاثیر تھی۔ ان خطبوں میں ایک طرف اہلِ ایمان کو ان کے ابتدائی فرائض بتائے گئے، ان کے اندر جماعتی شعور پیدا کیا گیا، انہیں تقویٰ اور فضیلتِ اخلاق اور پاکیزگیِ سیرت کی تعلیم دی گئی، ان کو دینِ حق کی تبلیغ کے طریقے بتائے گئے، کامیابی کے وعدوں اور جنت کی بشارتوں سے ان کی ہمت بندھائی گئی، انہیں صبر و ثبات اور بلند حوصلگی کے ساتھ اللہ کی راہ میں جد و جہد کرنے پر ابھارا گیا اور فداکاری کا ایسا زبردست جوش اور ولولہ ان میں پیدا کیا گیا کہ وہ ہر مصیبت جھیل جانے اور مخالفت کے بڑے سے بڑے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ دوسری طرف مخالفین اور راہِ راست سے منہ موڑنے والوں اور غفلت کی نیند سونے والوں کو اُن قوموں کے انجام سے ڈرایا گیا جن کی تاریخ سے وہ خود واقف تھے، اُن تباہ شدہ بستیوں کے آثار سے عبرت دلائی گئی جن کے کھنڈروں پر سے شب و روز اپنے سفروں میں اُن کا گزر ہوتا تھا، توحید اور آخرت کی دلیلیں ان کھلی کھلی نشانیوں سے دی گئیں جو رات دن زمین اور آسمان میں اُن کی آنکھوں کے سامنے نمایاں تھیں اور جن کو وہ خود اپنی زندگی میں بھی ہر وقت دیکھتے اور محسوس کرتے تھے، شرک اور دعوائے خود مختاری اور انکارِ آخرت اور تقلید آبائی کی غلطیاں

ایسے بیّن دلائل سے واضح کی گئیں جو دل کو لگنے اور دماغ میں اُتر جانے والے تھے۔ پھر ان کے ایک ایک شُبہ کو رفع کیا گیا، ایک ایک اعتراض کا معقول جواب دیا گیا، ایک ایک اُلجھن جس میں وہ خود پڑے ہوئے تھے یا دوسروں کو اُلجھانے کی کوشش کرتے تھے، صاف کی گئی، اور ہر طرف سے گھیر کر جاہلیت کو ایسا تنگ پکڑا گیا کہ عقل و خرد کی دُنیا میں اس کے لیے ٹھہرنے کی کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ اس کے ساتھ پھر اُن کو خدا کے غضب اور قیامت کی ہولناکیوں اور جہنم کے عذاب کا خوف دلایا گیا، ان کے بُرے اخلاق اور غلط طرزِ زندگی اور جاہلانہ رسوم اور حق دشمنی اور مومن آزاری پر انہیں ملامت کی گئی، اور اخلاق و تمدن کے وہ بڑے بڑے بنیادی اصول ان کے سامنے پیش کیے گئے جن پر ہمیشہ سے خدا کی پسندیدہ صالح تہذیبوں کی تعمیر ہوتی چلی آ رہی ہے۔

یہ مرحلہ بجائے خود مختلف منزلوں پر مشتمل تھا جن میں سے ہر منزل میں دعوت زیادہ وسیع ہوتی گئی، جدوجہد اور مزاحمت زیادہ سخت ہوتی گئی، مختلف عقائد اور مختلف طرزِ عمل رکھنے والے گروہوں سے سابقہ پیش آتا گیا، اور اسی کے مطابق اللہ کی طرف سے آنے والے پیغامات میں مضامین کا تنوّع بڑھتا گیا —— یہ ہے قرآن مجید کی مکی سورتوں کا پس منظر۔

دعوت میں حکمت و موعظت کا لحاظ

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (النحل آیت ۱۲۵)	"اے نبی، اپنے رب کے راستے کی طرف دعوت دو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ"

اس میں بتایا گیا ہے کہ دعوت میں دو چیزیں ملحوظ رہنی چاہییں۔ ایک حکمت۔ دوسرے عمدہ نصیحت۔

حکمت کا مطلب یہ ہے کہ بے وقوفوں کی طرح اندھا دُھند تبلیغ نہ کی جائے۔ بلکہ دانائی کے ساتھ مخاطب کی ذہنیت، استعداد اور حالات کو سمجھ کر، نیز موقع و محل کو دیکھ کر بات کی جائے۔ ہر طرح کے لوگوں کو ایک ہی لکڑی سے نہ ہانکا جائے۔ جس شخص یا گروہ سے سابقہ پیش آئے، پہلے اُس کے مرض کی تشخیص کی جائے، پھر ایسے دلائل سے اس کا علاج کیا جائے جو اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں سے اس کے مرض کی جڑ نکال سکتے ہوں۔

عمدہ نصیحت کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ مخاطب کو صرف دلائل ہی سے مطمئن کرنے پر اکتفا نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جذبات کو بھی اپیل کیا جائے۔ بُرائیوں اور گمراہیوں کا محض عقلی حیثیت ہی سے ابطال نہ کیا جائے بلکہ انسان کی فطرت میں اُن کے لیے جو پیدائشی نفرت پائی جاتی ہے اُسے بھی ابھارا جائے، اور اُن کے بُرے نتائج کا

خوف دلایا جائے۔ ہدایت اور عملِ صالح کی محض صحت اور خوبی ہی عقلاً ثابت نہ کی جائے بلکہ اُن کی طرف رغبت اور شوق بھی پیدا کیا جائے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ نصیحت ایسے طریقے سے کی جائے جس سے دلسوزی اور خیر خواہی ٹپکتی ہو۔ مخاطب یہ نہ سمجھے کہ ناصح اسے حقیر سمجھ رہا ہے اور اپنی بلندی کے احساس سے لذت لے رہا ہے۔ بلکہ اسے یہ محسوس ہو کہ ناصح کے دل میں اس کی اصلاح کے لیے ایک تڑپ موجود ہے اور وہ حقیقت میں اس کی بھلائی چاہتا ہے۔ بحث و گفتگو کی نوعیت مناظرہ بازی اور عقلی کشتی اور ذہنی دنگل کی نہ ہو۔ اس میں کج بحثیاں اور الزام تراشیاں اور چوٹیں اور پھبتیاں نہ ہوں۔ اس کا مقصود حریفِ مقابل کو چپ کر دینا اور اپنی زبان آوری کے ڈنکے بجا دینا نہ ہو۔ بلکہ اس میں شیریں کلامی ہو۔ اعلیٰ درجہ کا شریفانہ اخلاق ہو۔ معقول اور دل لگتے دلائل ہوں۔ مخاطب کے اندر ضد اور بات کی پچ اور ہٹ دھرمی پیدا نہ ہونے دی جائے۔ سیدھے سیدھے طریقے سے اس کو بات سمجھانے کی کوشش کی جائے اور جب محسوس ہو کہ وہ کج بحثی پر اُتر آیا ہے تو اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ گمراہی میں زیادہ دُور نہ نکل جائے۔

دعوتِ حق کے لیے ٹھنڈا اور سنجیدہ اسلوب

وَقُلْ لِّعِبَادِيْ يَقُوْلُوا الَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَنْزَغُ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۔ رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِكُمْ ؕ اِنْ يَّشَاْ يَرْحَمْكُمْ اَوْ اِنْ يَّشَاْ يُعَذِّبْكُمْ ؕ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا

(بنی اسرائیل ۵۳-۵۴)

اور اے محمدؐ، میرے بندوں سے کہہ دو کہ زبان سے وہ بات نکالا کریں جو بہترین ہو۔ دراصل یہ شیطان ہے جو انسانوں کے درمیان فساد ڈلوانے کی کوشش کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔ تمہارا رب تمہارے حال سے زیادہ واقف ہے، وہ چاہے تو تم پر رحم کرے اور چاہے تو تمہیں عذاب دے دے۔ اور اے نبیؐ ہم نے تم کو لوگوں پر حوالہ دار بنا کر نہیں بھیجا ہے۔

یعنی اہلِ ایمان کفار اور مشرکین سے اور اپنے دین کے مخالفین سے گفتگو اور مباحثے میں تیز کلامی اور مبالغے اور غلو سے کام نہ لیں۔ مخالفین خواہ کیسی ہی ناگوار باتیں کریں مسلمانوں کو بہرحال نہ تو کوئی بات خلافِ حق زبان سے نکالنی چاہیے اور نہ غصے میں آپے سے باہر ہو کر بیہودگی کا جواب بیہودگی سے دینا چاہیے۔ انہیں ٹھنڈے دل سے وہی

بات کہنی چاہیے جو جچی تلی ہو، برحق ہو، اور اُن کی دعوت کے وقار کے مطابق ہو۔

اور جب کبھی بہتی مخالفین کی بات کا جواب دیتے وقت غصّے کی آگ اپنے اندر بھڑکتی محسوس ہو، اور طبیعت بے اختیار جوش میں آتی نظر آئے تو فوراً سمجھ لو کہ یہ شیطان ہے جو تمہیں اُکسا رہا ہے تاکہ دعوتِ دین کا کام خراب ہو۔ اس کی کوشش یہ ہے کہ تم بھی اپنے مخالفین کی طرح اصلاح کا کام چھوڑ کر اُسی جھگڑے اور فساد میں لگ جاؤ جس میں وہ نوعِ انسانی کو مشغول رکھنا چاہتا ہے۔

اور اہلِ ایمان کی زبان پر کبھی ایسے دعوے بھی نہ آنے چاہییں کہ ہم جنتی ہیں اور فلاں شخص یا گروہ دوزخی ہے۔ اس کا فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ خود نبی کا کام بھی صرف دعوت دینا ہے۔ لوگوں کی قسمتیں اُس کے ہاتھ میں نہیں دے دی گئی ہیں کہ وہ کسی کے حق میں رحمت کا اور کسی کے حق میں عذاب کا فیصلہ صادر کر دے۔

داعی کا منصب اور اس کی ذمہ داری

قَدْ جَآءَكُمْ بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ، وَمَنْ عَمِیَ فَعَلَيْهَا وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ (الانعام - ۱۰۴)	"دیکھو، تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔ میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔"

"میں تم پر پاسبان نہیں ہوں" یعنی میرا کام صرف اتنا ہے کہ اُس روشنی کو تمہارے سامنے پیش کر دوں جو تمہارے رب کی طرف سے آئی ہے۔ اس کے بعد آنکھیں کھول کر دیکھنا یا نہ دیکھنا تمہارا اپنا کام ہے۔ میرے سپرد یہ خدمت نہیں کی گئی ہے کہ جنہوں نے خود آنکھیں بند کر رکھی ہیں ان کی آنکھیں زبردستی کھولوں اور جو کچھ وہ نہیں دیکھتے وہ انہیں دکھا کر ہی چھوڑوں۔

اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِیَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ، وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ، وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ، وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ	"اے نبی، اُس وحی کی پیروی کیے جاؤ جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔ اُس کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔ اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔ اگر اللہ کی مشیت

حَفِيظًا ، وَمَآ اَنۡتَ عَلَيۡهِمۡ بِوَكِيۡلٍ (الانعام ۱۰۶ - ۱۰۷)

یہ ہوتی (کہ یہ لوگ شرک نہ کریں) تو یہ شرک نہ کرتے۔ تم کو ہم نے ان پر پاسبان مقرر نہیں کیا ہے اور نہ تم ان پر حوالہ دار ہو"

مطلب یہ ہے کہ تمہیں داعی اور مبلغ بنایا گیا ہے کوتوال نہیں بنایا گیا۔ تمہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے اس روشنی کو پیش کر دو اور اظہارِ حق کا حق ادا کرنے میں اپنی حد تک کوئی کسر اٹھا نہ رکھو۔ اب اگر کوئی اس حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے۔ تم کو نہ اس کام پر مامور کیا گیا ہے کہ لوگوں کو حق پرست بنا کر ہی رہو، اور نہ تمہاری ذمہ داری وجواب دہی میں یہ بات شامل ہے کہ تمہارے حلقۂ نبوّت میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس فکر میں خواہ مخواہ اپنے ذہن کو پریشان نہ کرو کہ اندھوں کو کس طرح بینا کیا جائے اور جو آنکھیں کھول کر نہیں دیکھنا چاہتے انہیں کیسے دکھایا جائے۔ اگر فی الواقع حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہوتا کہ دُنیا میں کوئی شخص باطل پرست نہ رہنے دیا جائے تو اللہ کو یہ کام تم سے لینے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا اس کا ایک ہی تکوینی اشارہ تمام انسانوں کو حق پرست نہ بنا سکتا تھا؟ مگر وہاں تو مقصود سرے سے یہ ہے ہی نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ انسان کے لیے حق اور باطل کے انتخاب کی آزادی باقی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ وہ دونوں چیزوں میں سے کس کو انتخاب کرتا ہے۔ پس تمہارے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو روشنی تمہیں دکھا دی گئی ہے اس کے اُجالے میں سیدھی راہ پر خود چلتے رہو، اور دوسروں کو اس کی دعوت دیتے رہو۔ جو لوگ اس دعوت کو قبول کر لیں انہیں سینے سے لگاؤ اور ان کا ساتھ نہ چھوڑو، خواہ وہ دُنیا کی نگاہ میں کیسے ہی حقیر ہوں۔ اور جو اسے قبول نہ کریں ان کے پیچھے نہ پڑو، جس انجامِ بد کی طرف وہ خود جانا چاہتے ہیں اور جانے پر مُصر ہیں اس کی طرف جانے کے لیے انہیں چھوڑ دو۔

تبلیغ کا آسان طریقہ

وَنُيَسِّرُكَ لِلۡيُسۡرٰى ، فَذَكِّرۡ اِنۡ نَّفَعَتِ الذِّكۡرٰى (الاعلیٰ ۸ - ۹)

"اور اے نبی، ہم تم کو آسان طریقے کی سہولت دیتے ہیں، پس نصیحت کرو اگر نصیحت نافع ہو"

یعنی اے نبی ہم تبلیغِ دین کے معاملہ میں تم کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتے کہ تم بہروں کو سُناؤ اور اندھوں

کو راہ دکھاؤ۔ بلکہ آسان طریقہ تمہارے لیے میسّر کیے دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ نصیحت کرو جہاں نہیں یہ محسوس ہو کہ کوئی اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے۔ اب رہی یہ بات کہ کون اس سے فائدہ اٹھانے کے لیے تیار ہے اور کون نہیں ہے؟ تو ظاہر ہے کہ اس کا پتہ تبلیغ عام ہی سے چل سکتا ہے۔ اس لیے عام تبلیغ تو جاری رکھنی چاہیے مگر اس سے مقصود یہ ہونا چاہیے کہ اللہ کے بندوں میں سے ان لوگوں کو تلاش کیا جائے جو اس سے فائدہ اٹھا کر راہِ راست اختیار کرلیں۔ یہی لوگ تمہاری نگاہِ التفات کے مستحق ہیں اور انہی کی تعلیم و تربیت پر تمہیں توجہ صرف کرنی چاہیے۔ ان کو چھوڑ کر ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی تمہیں کوئی ضرورت نہیں ہے جن کے متعلق تجربہ سے تمہیں معلوم ہو جائے کہ وہ کوئی نصیحت قبول نہیں کرنا چاہتے۔

تبلیغ اسلام کے نقطۂ نظر سے اصل اہمیت کن لوگوں کی ہے

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۖ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ (الانعام - ۵۲)

"اور اے نبی جو لوگ اپنے رب کو رات دن پکارتے رہتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طلبگار ہیں انہیں اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کا بار تم پر نہیں اور تمہارے حساب میں سے کسی چیز کا بار ان پر نہیں۔ پھر بھی تم انہیں دُور پھینکو گے تو ظالم ہو گے۔"

جو لوگ ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے اُن میں بکثرت ایسے بھی تھے جو غریب یا غلام یا محنت پیشہ تھے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض تھا کہ آپ کے گرد و پیش ہماری قوم کے ادنیٰ طبقہ کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ اس شخص کو ساتھی بھی کیسے کیسے "معزز" لوگ ملے ہیں، بلالؓ، عمارؓ، صہیبؓ، خبابؓ۔ بس یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان ایسے ملے جن کو برگزیدہ کہا جا سکتا تھا! پھر وہ ایمان لانے والوں کی خستہ حالی کا مذاق اُڑانے پر ہی اکتفا نہ کرتے تھے بلکہ ان میں سے جس سے بھی کوئی اخلاقی کمزوری پہلے کبھی ظاہر ہوئی تھی اس پر بھی حرف گیری کرتے اور کہتے تھے کہ فلاں جو کل تک یہ تھا اور فلاں جس نے یہ کیا تھا آج وہ بھی اس "برگزیدہ گروہ" میں شامل ہے۔

انہی باتوں کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ طالبِ حق بن کر تمہارے پاس آتے ہیں

انہیں اِن بڑے بڑے لوگوں کی خاطر اپنے سے دُور نہ پھینکو۔ اگر کوئی پہلے کسی غلطی کا مرتکب ہوا بھی تھا تو اس کی ذمہ داری تم پر تو عائد نہیں ہوتی۔

حضرت ابن ام مکتوم رضؓ کا واقعہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں مکہ معظمہ کے چند بڑے سردار بیٹھے ہوئے تھے اور حضورؐ ان کو اسلام قبول کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش فرما رہے تھے۔[1] اتنے میں ابنِ اُمِ مکتوم نامی ایک نابینا حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہوں نے آپ سے اسلام کے متعلق کچھ پوچھنا چاہا۔ حضورؐ کو ان کی یہ مداخلت ناگوار ہوئی اور آپؐ نے ان سے بے رُخی برتی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے سورۂ عبس نازل ہوئی۔

عَبَسَ وَ تَوَلّٰٓى اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى — "تُرش رو ہوا اور بے رُخی برتی اس بات پر کہ وہ اندھا اُس کے پاس آگیا"
(آیات ۱-۲)

بظاہر کلام کے آغاز کا اندازِ بیان دیکھ کر آدمی یہ محسوس کرتا ہے کہ نابینا سے بے رُخی برتنے اور بڑے بڑے سرداروں کی طرف توجہ کرنے کی بنا پر اس سورہ میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب فرمایا گیا ہے۔ لیکن پوری سورت پر مجموعی حیثیت سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دراصل عتاب کفارِ قریش کے اُن سرداروں پر کیا گیا ہے جو اپنے تکبر اور ہٹ دھرمی اور صداقت سے بے نیازی کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغِ حق کو حقارت کے ساتھ رد کر رہے تھے، اور حضورؐ کو تبلیغ کا صحیح طریقہ بتانے کے ساتھ ساتھ اُس طریقے کی غلطی سمجھائی گئی ہے جو اپنی رسالت کے کام کی ابتدا میں آپ اختیار فرما رہے تھے۔ آپ کا ایک نابینا سے بے رُخی برتنا اور سردارانِ قریش کی طرف توجہ کرنا کچھ اس بنا پر نہ تھا کہ آپ بڑے لوگوں کو معزز اور ایک بیچارے نابینا کو حقیر سمجھتے تھے، اور معاذ اللہ یہ کوئی کج خلقی آپؐ کے اندر پائی جاتی تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے گرفت فرمائی۔ بلکہ معاملہ کی اصل نوعیت یہ ہے کہ ایک داعی جب اپنی دعوت کا آغاز کرنے لگتا ہے تو فطری طور پر اس کا رُجحان اس طرف ہوتا ہے کہ قوم

---

[1] حضورؐ کی مجلس میں جو لوگ اس وقت بیٹھے تھے، مختلف روایات میں، ان کے ناموں کی صراحت کی گئی ہے۔ اس فہرست میں ہمیں عتبہ، شیبہ، ابوجہل، اُمیّہ بن خلف، اُبیّ بن خلف جیسے بدترین دشمنانِ اسلام کے نام ملتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اُس زمانے میں پیش آیا تھا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیساتھ ان لوگوں کا میل جول ابھی باقی تھا اور کشمکش اتنی نہ بڑھی تھی کہ آپ کے ہاں اُن کی آمد و رفت اور آپکے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ بند ہو گیا ہو۔ (مؤلف)

کے باثر لوگ اس کی دعوت قبول کرلیں تاکہ کام آسان ہوجائے ورنہ عام بے اثر، معذور یا کمزور لوگوں میں دعوت پھیل بھی جائے تو اس سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑ سکتا۔ قریب قریب یہی طرزِ عمل دعوت کی ابتدا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اختیار فرمایا تھا جس کا محرک سراسر اخلاص اور دعوتِ حق کو فروغ دینے کا جذبہ تھا نہ کہ بڑے لوگوں کی تعظیم اور چھوٹے لوگوں کی تحقیر کا تخیل۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھایا کہ اسلامی دعوت کا صحیح طریقہ یہ نہیں ہے، بلکہ اس دعوت کے نقطۂ نظر سے ہر وہ انسان اہمیت رکھتا ہے جو طالبِ حق ہو، چاہے وہ کیسا ہی کمزور، بے اثر، یا معذور ہو، اور ہر وہ شخص غیر اہم ہے جو حق سے بے نیازی برتتے، خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی بڑا مقام رکھتا ہو۔ اس لیے آپ اسلام کی تعلیمات تو ہانکے پکارے سب کو سنائیں، مگر آپ کی توجہ کے اصل مستحق وہ لوگ ہیں جن میں قبولِ حق کی آمادگی پائی جاتی ہو، اور آپ کی بلند پایہ دعوت کے مقام سے یہ بات فروتر ہے کہ آپ اسے اُن مغرور لوگوں کے آگے پیش کریں جو اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں یہ سمجھتے ہوں کہ ان کو آپ کی نہیں بلکہ آپ کو ان کی ضرورت ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكَّىٰ أَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنفَعَهُ الذِّكْرَىٰ۔ أَمَّا مَنِ اسْتَغْنَىٰ فَأَنتَ لَهُ تَصَدَّىٰ۔ وَمَا عَلَيْكَ أَلَّا يَزَّكَّىٰ۔ وَأَمَّا مَن جَاءَكَ يَسْعَىٰ وَهُوَ يَخْشَىٰ فَأَنتَ عَنْهُ تَلَهَّىٰ۔ كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَن شَاءَ ذَكَرَهُ

(آیات ۳ تا ۱۲)

"اے نبی، تمہیں کیا خبر، شاید کہ وہ سُدھر جائے یا نصیحت پر دھیان دے اور نصیحت کرنا اُس کے لیے نافع ہو؟ جو شخص بے پروائی برتتا ہے اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو، حالانکہ وہ نہ سُدھرے تو تم پر اس کی کیا ذمہ داری ہے؟ اور جو خود تمہارے پاس دوڑا آتا ہے اور ڈر رہا ہوتا ہے اس سے تم بے رُخی برتتے ہو۔ ہرگز نہیں۔ یہ تو ایک نصیحت ہے جس کا جی چاہے، اسے قبول کرے"۔

یہی وہ اصل نکتہ ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغِ دین کے معاملہ میں اس موقع پر نظر انداز کر دیا تھا اور اسی کو سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے پہلے ابن اُم مکتومؓ کے ساتھ آپ کے طرزِ عمل پر گرفت فرمائی، پھر آپ کو بتایا کہ داعیِ حق کی نگاہ میں حقیقی اہمیت کس چیز کی ہونی چاہیے اور کس کی نہ ہونی چاہیے۔ ایک وہ شخص ہے جس کی ظاہری حالت صاف بتا رہی ہے کہ وہ طالبِ حق ہے، اس بات سے ڈر رہا ہے کہ کہیں وہ باطل کی پیروی کرکے خدا کے غضب میں مبتلا نہ ہوجائے۔ اس لیے وہ راہِ راست کا علم حاصل کرنے کی خاطر خود چل کر آتا ہے۔ دوسرا وہ

شخص ہے جس کا رویہ صریحاً یہ ظاہر کر رہا ہے کہ اس میں حق کی کوئی طلب نہیں پائی جاتی، بلکہ وہ اپنے آپ کو اس سے بے نیاز سمجھتا ہے کہ اُسے راہِ راست بتائی جائے۔ اِن دونوں قسم کے آدمیوں کے درمیان دیکھنے کی چیز یہ نہیں ہے کہ کون ایمان لے آئے تو دین کے لیے بہت مفید ہو سکتا ہے اور کس کا ایمان لانا دین کے فروغ میں کچھ زیادہ مفید نہیں ہو سکتا، بلکہ دیکھنا یہ چاہیے کہ کون ہدایت کو قبول کر کے سُدھرنے کے لیے تیار ہے اور کون اِس متاعِ گراں مایہ کا سرے سے قدردان ہی نہیں ہے۔ پہلی قسم کا آدمی خواہ اندھا ہو، لنگڑا ہو، لُولا ہو، فقیر بے نوا ہو، بظاہر دین کے فروغ میں کوئی بڑی خدمت انجام دینے کے قابل نظر نہ آتا ہو، بہرحال داعیِ حق کے لیے وہی قیمتی آدمی ہے، اسی کی طرف اسے توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس دعوت کا اصل مقصد بندگانِ خدا کی اصلاح ہے، اور اِس شخص کا حال یہ بتا رہا ہے کہ اُسے نصیحت کی جائے گی تو وہ اصلاح قبول کرلے گا۔ رہا دوسری قسم کا آدمی تو خواہ وہ معاشرے میں کتنا ہی با اثر ہو، اس کے پیچھے پڑنے کی داعیِ حق کو کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کی رَوِش علانیہ یہ بتا رہی ہے کہ وہ سُدھرنا نہیں چاہتا، اس لیے اس کی اصلاح کی کوشش میں وقت صرف کرنا وقت کا ضیاع ہے۔ وہ اگر نہ سُدھرنا چاہے تو نہ سُدھرے، نقصان اس کا اپنا ہوگا، داعیِ حق پر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ جن نابینا کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان سے مراد، مشہور صحابی حضرت ابن اُمِّ مکتومؓ ہیں۔ حافظ ابن عبدالبرؒ نے الاستیعاب میں اور حافظ ابن حجرؒ نے الاصابہ میں بیان کیا ہے کہ یہ اُمّ المومنین حضرت خدیجہؓ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔ ان کی ماں اُمِّ مکتوم اور حضرت خدیجہؓ کے والد خُویلد آپس میں بہن بھائی تھے۔ حضورؐ کے ساتھ ان کا یہ رشتہ معلوم ہو جانے کے بعد اِس شبہ کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ آپ نے اُن کو غریب یا کم حیثیت آدمی سمجھ کر ان سے بے رُخی برتی اور بڑے آدمیوں کی طرف توجہ فرمائی تھی، کیونکہ یہ حضورؐ کے اپنے برادرِ نسبتی تھے، خاندانی آدمی تھے، کوئی گرے پڑے آدمی نہ تھے۔ اصل وجہ جس کی بنا پر آپؐ نے ان کے ساتھ یہ رویّہ اختیار کیا، لفظ اَعمیٰ (نابینا) سے معلوم ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضورؐ کی بے اعتنائی کے سبب کی حیثیت سے خود بیان فرما دیا ہے۔ یعنی حضورؐ کا خیال یہ تھا کہ میں اس وقت جن لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کر رہا ہوں ان میں سے کوئی ایک آدمی بھی ہدایت پالے تو اسلام کی تقویت کا بڑا ذریعہ بن سکتا ہے۔ بخلاف اس کے ابنِ مکتوم ایک نابینا آدمی ہیں، اپنی معذوری کے باعث یہ اسلام کے لیے اُس قدر مفید ثابت نہیں ہو سکتے جس قدر ان سرداروں میں سے کوئی مسلمان ہو کر مفید ہو سکتا ہے اس لیے ان کو اس موقع پر گفتگو میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے، یہ جو کچھ سمجھنا یا معلوم کرنا چاہتے ہیں اُسے بعد میں کسی وقت بھی دریافت کر سکتے ہیں۔

حکمتِ تبلیغ

وَلَا تُجَادِلُوْٓا اَهْلَ الْكِتٰبِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔	اور اہلِ کتاب سے بحث نہ کرو مگر عمدہ طریقہ سے

(عنکبوت آیت ۴۶)

یعنی مباحثہ معقول دلائل کے ساتھ، مہذب و شائستہ زبان میں، اور افہام و تفہیم کی سپرٹ میں ہونا چاہیے تاکہ جس شخص سے بحث کی جا رہی ہو اس کے خیالات کی اصلاح ہو سکے۔ مُبلّغ کو فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ وہ مخاطب کے دل کا دروازہ کھول کر حق بات اس میں اتار دے اور اسے راہِ راست پر لائے۔ اس کو ایک پہلوان کی طرح نہیں لڑنا چاہیے جس کا مقصد اپنے مدِّمقابل کو نیچا دکھانا ہوتا ہے، بلکہ اس کو ایک حکیم کی طرح چارہ گری کرنی چاہیے جو مریض کا علاج کرتے ہوئے ہر وقت یہ بات ملحوظ رکھتا ہے کہ اس کی اپنی کسی غلطی سے مریض کا مرض اور زیادہ بڑھ نہ جائے، اور اس امر کی پوری کوشش کرتا ہے کہ کم سے کم تکلیف کے ساتھ مریض شفایاب ہو جائے۔ یہ ہدایت اس مقام پر تو موقع کی مناسبت سے اہلِ کتاب کے ساتھ مباحثہ کرنے کے معاملہ میں دی گئی ہے، مگر یہ اہلِ کتاب کے لیے مخصوص نہیں ہے، بلکہ تبلیغِ دین کے باب میں ایک عام ہدایت ہے جو قرآن مجید میں جگہ جگہ دی گئی ہے مثلاً

اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ ۔ (النحل۔ آیت ۱۲۵)	دعوت دو اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور عمدہ پند و نصیحت کے ساتھ اور لوگوں سے مباحثہ کرو ایسے طریقہ پر جو بہترین ہو۔
وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۚ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۔ (حٰم السجدہ۔ آیت ۳۴)	بھلائی اور برائی یکساں نہیں (مثلاً مخالفین کے حملوں کی) مدافعت ایسے طریقہ سے کرو جو بہترین ہو، تم دیکھو گے کہ وہی شخص جس کے اور تمہارے درمیان عداوت تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے گرم جوش دوست ہے۔
اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ السَّيِّئَةَ ۚ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا يَصِفُوْنَ ۔ (المومنون۔ آیت ۹۶)	تم بدی کو اچھے ہی طریقہ سے دفع کرو، ہمیں معلوم ہے جو باتیں وہ (تمہارے خلاف) بناتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۔ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۔ (الاعراف ۔ آیات ۱۹۹ ۔ ۲۰۰)

درگزر کی روش اختیار کرو، بھلائی کی تلقین کرو، اور جاہلوں کے منہ نہ لگو۔ اور اگر (ترکی بہ ترکی جواب دینے کے لیے) شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو۔

دعوتِ حق کے لیے ضروری اوصاف

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ۔ وَإِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۔ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ۔ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ۔
(الاعراف ۔ آیات ۱۹۹ تا ۲۰۲)

اے نبیؐ، نرمی و درگزر کا طریقہ اختیار کرو، معروف کی تلقین کیے جاؤ، اور جاہلوں سے نہ اُلجھو۔ اگر کبھی شیطان تمہیں اُکسائے تو اللہ کی پناہ مانگو، وہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔ حقیقت میں جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی برا خیال اگر انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آنے لگتا ہے کہ ان کے لیے صحیح طریقِ کار کیا ہے۔ رہے ان کے (یعنی شیاطین کے) بھائی بند، تو وہ انہیں ان کی کج روی میں کھینچے لیے جاتے ہیں اور انہیں بھٹکانے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھتے۔

ان آیات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت و تبلیغ اور ہدایت و اصلاح کی حکمت کے چند اہم نکات بتائے گئے ہیں اور مقصود صرف حضورؐ ہی کو تعلیم دینا نہیں ہے بلکہ حضورؐ کے ذریعہ سے اُن سب لوگوں کو یہی حکمت سکھانا ہے جو حضورؐ کے قائم مقام بن کر دُنیا کو سیدھی راہ دکھانے کے لیے اُٹھیں۔ ان نکات کو سلسلہ وار دیکھنا چاہیے:

(۱) داعیِ حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو، متحمّل اور

عالی ظرف ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقا کی کمزوریوں کو بھی برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اُسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو بھی عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ مخالفوں کی طرف سے کیسی ہی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی، اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اُس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشت خوئی، تلخ گفتاری اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اِس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتا ہے اور اِس سے کام بگڑتا ہے، بنتا نہیں ہے۔ اسی چیز کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ "غضب اور رضا، دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں، جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں، جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کر دوں"۔ اور اسی چیز کی ہدایت آپ ان لوگوں کو دیتے تھے جنھیں آپ دین کے کام پر اپنی طرف سے بھیجتے تھے کہ بَشِّرُوْا وَلَا تُنَفِّرُوْا وَيَسِّرُوْا وَلَا تُعَسِّرُوْا، یعنی "جہاں تم جاؤ وہاں تمھاری آمد لوگوں کے لیے مژدۂ جانفزا ہو نہ کہ باعثِ نفرت، اور لوگوں کے لیے تم سہولت کے موجب بنو نہ کہ تنگی و سختی کے"، اور اسی چیز کی تعریف اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فرمائی ہے کہ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ۔ یعنی "یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو ورنہ اگر تم درشت خُو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب لوگ تمھارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے"۔ (آل عمران، ۱۵۹)

(۲) دعوتِ حق کی کامیابی کا گُر یہ ہے کہ آدمی فلسفہ طرازی اور دقیقہ سنجی کے بجائے لوگوں کو معروف یعنی اُن سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کرے جنھیں بالعموم سارے ہی انسان بھلا جانتے ہیں یا جن کی بھلائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام (Common Sense) کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیِ حق کی اپیل عوام و خواص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اِس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ کیونکہ عام انسان، خواہ وہ کتنے ہی تعصبات میں مبتلا ہوں، جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دے رہا ہے اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر رہے ہیں تو رفتہ رفتہ ان کے دل خود بخود مخالفینِ حق سے پھرتے اور داعیِ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ آخرکار میدانِ مقابلہ

میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل کے قیام ہی سے وابستہ ہوں، یا پھر جن کے دلوں میں تقلیدِ اسلاف اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کے قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔ یہی وہ حکمت تھی جس کی بدولت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عرب میں کامیابی حاصل ہوئی اور پھر آپ کے بعد تھوڑی ہی مدت میں اسلام کا سیلاب قریب کے ملکوں پر اس طرح پھیل گیا کہ کہیں ۱۰۰ فی صدی اور کہیں ۸۰، اور ۹۰ فی صدی باشندے مسلمان ہو گئے۔

(۳) اس دعوت کے کام میں یہ بات جتنی ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جائے اتنی ہی یہ بات بھی ضروری ہے کہ جاہلوں سے نہ اُلجھا جائے خواہ وہ اُلجھنے کی کتنی ہی کوشش کریں۔ داعی کو اس معاملہ میں سخت محتاط ہونا چاہیے کہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے رہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔ اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالوپن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جھگڑے میں اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعتِ دعوت اور اصلاحِ نفوس میں خرچ ہونا چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہو جاتی ہے۔

(۴) اوپر نمبر ۳ میں جو ہدایت دی گئی ہے اسی کے سلسلہ میں مزید ہدایت یہ ہے کہ جب کبھی داعیِ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضات و الزامات پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ نزغِ شیطانی (یعنی شیطان کی اُکساہٹ) ہے اور اُسی وقت اُسے خدا سے پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہر حال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اُٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر، خوب سوچ سمجھ کر اُٹھایا جائے۔ لیکن شیطان، جو اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا، ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعیِ حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعیِ حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے، اکثر بڑی بڑی پُرفریب تاویلوں اور مذہبی اصطلاحوں کے غلاف میں لپٹی ہوئی ہوتی ہے۔ لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی۔ اسی لیے آخری دو آیتوں میں فرمایا کہ جو لوگ متقی (یعنی خدا ترس اور بدی سے بچنے کے خواہشمند) ہیں وہ تو اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک

محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آ جاتا ہے کہ اس موقع پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل کے اختیار کرنے میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کے کام میں نفسانیت کی لاگ لگی ہوئی ہے اور اس وجہ سے جن کا شیاطین کے ساتھ بھائی چارے کا تعلق ہے، تو وہ شیطانی تحریک کے مقابلہ میں نہیں ٹھیر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہ پر چل نکلتے ہیں۔ پھر جس جس وادی میں شیطان چاہتا ہے انہیں لیے پھرتا ہے اور کہیں جا کر ان کے قدم نہیں رُکتے۔ مخالف کی ہر گالی کے جواب میں ان کے پاس ایک گالی اور ہر چال کے جواب میں اس سے بڑھ کر ایک چال موجود ہوتی ہے۔

اس ارشاد کا ایک عمومی محل بھی ہے۔ اور وہ یہ کہ اہلِ تقویٰ کا طریقہ بالعموم اپنی زندگی میں غیر متقی لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ جو لوگ حقیقت میں خدا سے ڈرنے والے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ بُرائی سے بچیں اُن کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی ان کے دل کو چھُو جاتا ہے تو انہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چبھ جانے یا آنکھ میں کسی ذرّے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے، اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اُسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح انگلی کے لیے پھانس، یا آنکھ کے لیے ذرّہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ، یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اِس غبارِ شر کو اپنے اوپر سے جھاڑ دینے میں لگ جاتا ہے۔ بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں، اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہوتی ہے ان کے نفس میں بُرے خیالات، بُرے ارادے، بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اُپراہٹ اپنے اندر محسوس نہیں کرتے، بالکل اُسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سؤر کا گوشت پک رہا ہو، اور وہ بے خبر ہو کہ اس کے اندر کیا پک رہا ہے، یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوئے ہوں اور اسے کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔

(باقی)

دین و شریعت کو نقصان پہنچانے والے چار گروہ

(جناب حبیب ریحان ندوی)

شریعت کے احکام واجب الاتباع ہیں شریعت کے منصوص اوامر و احکام اور مقرر کردہ حدود چاہے وہ عبادات سے متعلق ہوں یا معاملات، اجتماعیات اور سوسائٹی کی دوسری چیزوں سے متعلق ہر مسلمان کے لیے واجب الاتباع ہیں، ان کی شریعت کا منکر کافر ہے اور مرتد ہو جانے کے جرم میں اگر شروط توبہ مرتد کے ماتحت توبہ نہ کرے اور اسلام کے دائرہ میں واپس نہ آئے تو واجب القتل ہے۔ اُن کو جان بوجھ کر مسلسل چھوڑنے والا بھی فقہا کے آسان سے آسان اقوال کے مطابق لائق تعزیر ہے۔ یہ حکم اُن غیر مختلف فیہ احکام کے بارے میں ہے جن میں واضح نص موجود ہے کیونکہ نص کے بعد اجتہاد و قیاس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

ضرورت کے وقت اجتہاد ضروری ہے لیکن وہ فروعی، جزوی اور فقہی احکام جن میں واضح نص نہیں ہے، یا نصوص میں تعدد ہے، یا مختلف توجیہات و آراء ممکن ہیں، یا اجتہاد و قیاس کی گنجائش ہے، وہ اس سے خارج ہیں، بلکہ ان میں اجتہاد و تفقہ، بحث و مباحثہ، صحیح طریقہ پر شریعت کی حکمت معلوم کرنا اور علمی اختلاف کے ذریعہ صحیح حل تک پہنچنا نہ صرف یہ کہ گناہ نہیں ہے، بلکہ حسنِ نیت، اور اجتہاد کی شروط کی موجودگی میں اور ضرورت کے وقت واجب اور ضروری ہے۔ شریعت کی حکمت سے قریب تر صحیح حل پیش کرنے والا غرض قسمت دو ثوابوں کا مستحق ہوگا، اور اجتہادی غلطی کرنے والے کو بھی ایک اجر اس کے حسنِ نیت اور سعی و جہد کا ضرور ملے گا۔ یہ اجتہاد اس لیے شرعی و عقلی طور پر ضروری ہے کہ اسلام سب سے آخری پیغام ہے، کمالِ دین اور اتمامِ نعمت کی شکل میں اس طرح مکمل و محیط ہو چکا ہے کہ اب کسی دوسرے دین کے آنے کا امکان نہیں ہے، اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں جن پر آخری شریعت نازل ہو چکی ہے اس لیے اب کسی حقیقی یا مجازی، ظلی یا بروزی، ظاہری یا باطنی نبی کے آنے کا امکان بھی کسی مسلمان کے عقیدہ میں شرعی و عقلی دونوں طریقوں پر ختم ہو گیا ہے۔ اب چونکہ یہ شریعت دائمی ہے اس لیے اس کی نصوص سے جملہ پیش آنے والے مسائل میں اجتہاد و قیاس و استنباط کے شرعی طریقوں سے مناسب حل نکالنے ضروری ہیں، کیونکہ زندہ و پائندہ شریعت کی یہی علامت

ہے کہ وہ کسی زمانہ میں کسی مشکل کا بھی حل پیش کرنے سے قاصر و عاجز نہ ہو۔

محافظین اسلام کی فوج ظفر موج ابتدائے اسلام سے آج تک جہاں بے شمار مفسرین، محدثین اور فقہاء و مجتہدین اسلامی عقیدہ و شریعت اور احکام کی حفاظت کرتے رہے، اس کے منصوص اوامر کی پابندی کرتے رہے، اسلام کے دائرہ اعتقاد و عمل سے انہوں نے سرمو تجاوز نہیں کیا اور جدید مسائل کے لیے نص کی عدم موجودگی میں اجتہاد و قیاس کو کام میں لاکر نصوص شریعت کی روشنی میں شریعت کی حکمت کے مطابق احکام نکالتے رہے۔

دین کے خلاف کام کرنے والے گروہ بالکل اسی طرح شروع ہی سے بعض وہ افراد اور گروہ بھی پیدا ہوتے رہے جو دین کے معلوم و معروف عقائد، مقررہ عبادات اور منصوص احکام سے چھٹکارا پانے کی کوششیں کرتے رہے۔ اختصار کے ساتھ ان گروہوں کو چار قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ مدعیان نبوت اور ان کے متبع ایک قسم کا گروہ وہ ہے جو زیادہ جرأت و جسارت کے ساتھ مکمل طور پر دین سے بغاوت کرتا ہے۔ یہ نبوت کا دعویٰ کر دیتا ہے، پورا دجال و کذاب ہوتا ہے اور اس کے متبع اسے ختم نبوت کے واجب الاذعان عقیدہ کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں نبی مانتے ہیں۔ مدعیان نبوت میں بھی دو فرقے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جو حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر دیتا ہے۔ دوسرا وہ جو حضورؐ کی نبوت کے ساتھ اپنی نبوت کا اعلان بھی کرتا ہے۔ شرعی و فقہی اصطلاح اور حکم میں ان دونوں کے درمیان مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ گروہ درحقیقت تکمیل دین، اتمام نعمت، ابدیت اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے دائمی اور قیامت تک ساری انسانیت کے لیے شامل و کامل و محیط اور آپ کے رحمۃ للعالمین ہونے کا منکر ہے۔ اس معاملہ کو سمجھنے کے لیے کسی زیادہ عقلی ریاضت کی ضرورت نہیں۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ کسی دوسرے نبی کے آنے کا امکان ہی اسلام اور رسول اسلامؐ کی ان تمام خصوصیات، امتیازات اور کمال و دوام کے جملہ نظریات و اعتقادات کا بطلان ہے۔

۲۔ معطلین شریعت دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو اپنے آپ کو دین کے دائرے میں شامل قرار دیتے ہوئے دین کے ثابت شدہ شعائر فرائض اور واجبات اور قوانین اسلام کا منکر ہو جاتا ہے، جیسے نماز یا کسی ایک فرض نماز کی عدم شرعیت کا اعلان، زکوٰۃ کے وجوب کا انکار، روزہ اور حج کا انکار، یا سود، سور، خمر، زنا، اور دوسرے محرمات کے جواز کا اظہار، یا شادی بیاہ مہر و طلاق اور میراث وغیرہ کے احکام میں سے کسی بھی شرعی حکم کی عدم شرعیت کا اعلان۔ یہ خیال رہے کہ کسی واجب عمل کو چھوڑ دینے یا کسی حرام کام کا ارتکاب کرنے پر گناہ ضرور ہوگا، لیکن اگر مسلمان اس کی حرمت اور وجوب کا قائل ہے تو وہ باوجود گنہگار ہونے

کے اسلام کے دائرہ میں رہتا ہے۔ لیکن خدا کی نازل کردہ حرمت وحلت یا فرائض یا عقائد میں سے کسی چیز کا انکار کردینے والا بھی پہلے گروہ کی طرح فوری طور پر اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

۳۔ دل سے نظام اسلامی کے محاسن کا منکر گروہ | تیسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو دل سے اسلامی نظام کا قائل ہی نہیں ہوتا اور اسلامی نظام حیات میں اسے نقص نظر آتا ہے۔ اسلامی عبادات اسے مذاق معلوم ہوتی ہیں۔ اسلام کا عائلی قانون اس کو غلط اور نظام میراث اسے ظلم نظر آتا ہے۔ اسلام کے اقتصادی نظام پر اس کو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ وہ بھلا سود کو کیسے حرام کرتا ہے جب کہ تہذیب حاضر کی رگ و پے میں وہ سرایت کیے ہوئے ہے؟ اسلام کا نظام حدود و تعزیرات تو اسے سب سے بڑی درندگی اور وحشیت معلوم ہوتا ہے کیونکہ عصر حاضر کے فریب خوردہ تمدن نے اسے چوری، ڈکیتی، قتل و غارت، حرام کاری، اور شراب نوشی کا اس طرح عادی اور گرویدہ بنا دیا ہے کہ سوسائٹی سے ان گندگیوں کے ختم کرنے کا ارادہ ہی اس میں نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کی قدریں ہی بدل گئی ہیں۔ جھوٹ اور فریب کا نام سیاست پڑ گیا ہے، چوری اور ڈکیتی، جواں مردی اور بہادری کا نشان سمجھا جاتا ہے، حرام کاری اور فواحش کا نام فن اور آرٹ ہو گیا ہے۔ الغرض یہ گروہ دل سے نظام اسلامی، قانون اسلامی اور فکر اسلامی کو قرون وسطیٰ کا نظام پارینہ تصور کرتا ہے۔ لیکن زبان و قلم سے وہ ان چیزوں کا صاف صاف انکار نہیں کرتا، بلکہ اپنے آپ کو اسلام کا شیدائی اور دوست ثابت کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ ثابت کرتا ہے کہ اس کی کوششیں اس لیے ہیں کہ اسلام کا نام روشن ہو، اسلام کے وہ مسائل جن پر اغیار ہنستے ہیں اور مضحکہ اڑاتے ہیں، ان کو ہم اسلام کی محبت و عظمت کی خاطر اور نیک نامی کی خاطر عصر حاضر سے قریب کرنے کے لیے ان میں تاویلات کریں اور مصلحت اور عرف وغیرہ کے نام پر ان میں توافق پیدا کرنے یا تبدیلی کرنے کی کوشش کریں۔ پھر اس کوشش کے لیے یہ گروہ اجتہاد کی شرطوں کے فقدان، عربی زبان سے ناواقفیت یا عدم مہارت اور اسلامی علوم شریعت میں ضروری معلومات نہ ہونے کے باوجود خود کو بزعم خود مجتہد کے منصب پر فائز کر لیتا ہے اور پھر خود ساختہ مسائل و مشکلات کو حل کرنے کے لیے اجتہاد و قیاس کی کلہاڑی چلانی شروع کر دیتا ہے۔ اکثر موقعوں پر اسے یہ بھی خبر نہیں ہوتی کہ لا اجتہاد مع النص (حکم کی موجودگی میں اجتہاد نہیں ہے) اور اسی طرح قیاس کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ گروہ نئے مسائل ہی کو نہیں بلکہ پرانے اور شریعت میں منصوص مسائل کو بھی اجتہاد و قیاس کا تختہ مشق ستم بناتا ہے، اور غلط نتیجے نکالتا ہے۔ اس گروہ کو، جب تک وہ صراحت کے ساتھ نظام اسلامی کو ناقص، غیر کامل اور عصور حاضرہ کا ساتھ نہ دینے والا زبان و قلم سے نہ کہے، ہم دین کے دائرے سے خارج قرار نہیں دے سکتے، نہ اس کے لیے سزائے مرتد کا مطالبہ کر سکتے ہیں، نہ اس کے خلاف جہاد واجب کر سکتے ہیں، کیونکہ ہم ظاہر قول و فعل پر عمل کرنے کے مکلف ہیں، باطن کے احوال اور نیتوں کے

حُسن و قبح پر فیصلہ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ البتہ اس کو منافق کہہ سکتے ہیں۔

۴۔ اخلاص کے ساتھ غلط نتیجے نکالنے والا گروہ

ایک چوتھا گروہ وہ بھی ہوتا ہے جو واقعی انتہائی حسنِ نیت اور اخلاص کے ساتھ اسلامی شریعت، قانون اور نظامِ حیات کے بارے میں جدید مسائل و مشاکل وغیرہ سے متعلق آرا کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کے نتیجے اس لیے غلط ہوتے ہیں اور نقصان دہ بھی کہ وہ شرعی، عقلی اور علمی شرطوں کا حامل نہیں ہوتا۔ اجتہاد کی جو شرطیں ہیں ان میں اخلاص و حسنِ نیت صرف ایک شرط ہے۔ اس کے بعد بہت سی ایسی شرطیں ہیں جن کا وافر حد تک پایا جانا ازحد ضروری ہے۔ مثال کے طور پر عربی زبان کو اس کے اصول و قواعد کے ساتھ جاننا، جملہ تفسیر کے علوم پر دسترس ہونا، حدیث کے علوم کے ساتھ فن حدیث کی اصطلاحوں سے باخبر ہونا، فقہ کے تمام مذاہب اور اقوالِ فقہا وغیرہ پر عبور ہونا، وغیرہ۔ اور یہ بات کوئی اسلامی اجتہاد و علوم پر قلم اُٹھانے سے پہلے ہی ضروری نہیں ہے، اور نہ یہ کوئی ایسی بدعت ہے جسے رجعت پسند علماے جدید ریسرچ اسکالروں کے خلاف استعمال کرنا چاہتے ہیں، بلکہ دُنیا کے ہر علم و فن کے قواعد اس سے کہیں زیادہ سخت ہیں۔ کیا انتہائی حُسنِ نیت کے ساتھ کوئی شہرۂ آفاق ماہر اور قابل ترین انجینیر کسی سرجن کی خدمات انجام دینے کا تصور بھی کرسکتا ہے؟ اور اگر وہ ماضی تعلّی کی بنا پر یا عوام کی ووٹنگ اور رائے شماری میں اکثریت حاصل کرنے کے بعد یعنی آپریشن کرنے کے لیے اگر کوئی گروہ اس کا نام پیش کردے اور اکثریت سے وہ منظور بھی ہوجائے، اگر وہ کسی آپریشن کی جسارت کرنا چاہے تو کیا دُنیا کا کوئی ماڈرن، ترقی یافتہ، حُریتِ رائے کا دلدادہ شخص یا کوئی ہسپتال اسے اس غیرمناسب کام کے کرنے کی اجازت دے گا خواہ اس نے اپنے شوق سے سرجری کی کچھ کتابیں اُلٹ پلٹ کر دیکھ بھی لی ہوں؟ یا کیا کسی ماہر اور بین الاقوامی ڈاکٹر سے کوئی وزارتِ تعمیرات کسی پُل، ڈیم یا عمارت کا نقشہ بنوانے سے متعلق سوچ بھی سکتی ہے خواہ وہ یورپ و امریکہ کی ساری معماری ترقی دیکھ بھی چکا ہو، اور فلک بوس عمارتوں کے اندر رہ بھی چکا ہو؟

اس گروہ پر بھی ہم کفر و ارتداد تو دُور کی بات ہے فسق کا حکم بھی نہیں لگا سکتے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص تعلیمِ دین کی شروط کے بغیر تعلیم و تبلیغ کے لیے نہ صرف یہ کہ تیار ہوجائے بلکہ علماے دین، مفتیانِ شرع متین اور مجتہدینِ امت سے بھی زیادہ اپنے آپ کو اس کا مستحق سمجھنے لگے بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ان سے زیادہ دین کی صحیح فہم، مصلحتوں، حکمتوں اور شریعت کے تقاضوں کو سمجھنے کا بھی مدعی ہوجائے۔ اور آخری مرحلہ یہاں تک پہنچ جائے کہ علما، فضلا، فقہا پر نکتہ چینی، عیب جوئی، توہین اور دین کا صحیح فہم نہ رکھنے اور حقیقی اسلام کی ترجمانی نہ کرنے کی تہمت بھی لگانی شروع کردے۔ یا دوسری مثال یہ کہ وعظ و تقریر کی شرعی صلاحیت و اجازت کے بغیر، قرآن و حدیث و فقہ میں عبور

حاصل کرنے سے پہلے وعظ اور تقریریں شروع کردے اور وہ بھی اس دعوے کے ساتھ کہ جو کچھ ان وعظوں میں کہا جا رہا ہے وہی حق ہے اور اس کے سوا سب باطل ہے، تعلیمِ دین وقت کا ضیاع ہے، تالیف و تصنیف علمی غرور ہے، وغیرہ۔ یہ سب حرکتیں غلط ہیں، مگر کفر یا فسق نہیں ہیں۔

بہرحال چوتھے گروہ یعنی اخلاص کے ساتھ، لیکن اجتہاد و علم کے شروط کے بغیر اجتہاد کرنے والوں کے اخلاص کی ہم قدر کریں گے لیکن ان کے افعال و اقوال، تقریر و تحریر اور افراط و تفریط کو دین کا جزو ہرگز نہیں سمجھیں گے۔ ان حضرات کے ساتھ کیا طریقہ اختیار کیا جائے گا، اس کی تفصیل چند سطر بعد پیش کی جائے گی۔

اول الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت کا طریق کار

مدعی نبوت دین میں معلوم بالضرورت اور واجب وحتمی عقیدے کے انکار کی وجہ سے دین سے خارج ہو جاتا ہے، اس لیے مرتد کی سزا کا مستحق ہوتا ہے مستحل الدم اور واجب الجہاد ہوتا ہے، اور اس کے اس دعوے پر یقین کرنے والے بھی چونکہ اسلام سے پھر جاتے ہیں اور خلافِ اسلام عقیدے کو قبول کرتے ہیں، اس لیے وہ بھی اسلام سے خروج کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اسی طرح دین میں واجب کسی منصوص فریضہ کا انکار کرنے والے، جیسے نماز کا منکر، یا کسی ایک نماز کی شرعیت کا منکر، یا زکوٰۃ کے وجوب کا منکر، یا اسلامی عائلی قوانین کی شرعیت کا منکر، یا اسلامی حدود کے وجوب کا منکر، جملہ مختصر یہ کہ شریعت کی حرام کی ہوئی کسی چیز کے حلال اور شریعت کی حلال کی ہوئی کسی چیز کے حرام ہونے کا مدعی بھی دین سے خارج ہو جاتا ہے، اور یہ دین میں معلوم و منصوص حکم ہے۔ کیونکہ جس طرح شریعت کے ایک فریضہ کو فرض کرنے والا خدا ہے بالکل اسی طرح دوسرے فریضہ کو فرض کرنے والا بھی وہی ہے، جس نے نماز فرض کی ہے اسی نے زکوٰۃ مقرر کی ہے، جس نے شادی بیاہ کے احکام نازل کیے ہیں اسی نے میراث کے حصے مقرر کیے ہیں، جس نے تجارت کو حلال کیا ہے اسی نے سود کو حرام کیا ہے، جس نے شہد کو حلال کیا ہے اسی نے شراب کو حرام کیا ہے، جس نے قصاص و حدود و تعزیرات مقرر کی ہیں اسی نے اقتصادی نظام کی درستی کے لیے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے، جس نے ماں باپ یا بیٹا بیٹی سے شادی کرنے کی ممانعت کی ہے اسی خدا نے مشرک یا مشرکہ سے شادی حرام کی ہے۔ الغرض جس ذات ستودہ صفات نے طیبات کو حلال کیا ہے اسی ذات بے ہمتا نے تمام اشیائے خبیثہ کو حرام فرمایا ہے۔ اس لیے کسی ایک منصوص حرام چیز کے حلال ہونے اور منصوص حلال چیز کے حرام ہونے کا عقیدہ اسلام سے خروج کے لیے کافی ہے، کیونکہ اس سے خدا کی شریعت میں تفریق اور خدا کا انکار لازم آتا ہے۔

اسلامی حکومت ان دونوں گروہوں کو دین سے خارج کرنے میں کسی قسم کی تفریق نہیں کرتی، اور ان کے ساتھ

وہی طریقہ کار استعمال کرتی ہے جو خلیفۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے اختیار کیا تھا۔ آپ نے صحابہ کرام کے مشورے سے مدعیان نبوت، معطّلین شریعت اور مانعین زکوٰۃ، سب کو مرتدین کی فہرست میں شامل کر کے سب سے جہاد کا اعلان کیا تھا، اور اس جہاد برحق میں آپ کامیاب ہوئے تھے، اور یہی سب سے بڑی دلیل صدیق اکبر کے فیصلہ کی صحت اور آپ کی خلافت کی حقانیت کی تھی، کیونکہ قرآن کے معجزانہ بیان میں صاف طور پر یہ بیان کیا گیا ہے کہ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَنْ یَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِیْنِهٖ فَسَوْفَ یَاْتِی اللّٰهُ بِقَوْمٍ یُّحِبُّهُمْ وَیُحِبُّوْنَهٗۤ اَذِلَّةٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اَعِزَّةٍ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ یُجَاهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآىٕمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ (مائدہ - ۵۴) "اے ایمان والو جو تم میں سے پھر جائے (مرتد ہو جائے) اپنے دین سے تو اللہ ایسی قوم (جماعت) کو لائے گا جن سے وہ محبت کریگا اور وہ اس سے محبت کریں گے، مومنوں کے لیے وہ نرم، کافروں کے لیے سخت ہوں گے، راہِ خدا میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے، یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔" اس آیت کی روشنی میں صاف پتہ چلتا ہے کہ صدیق اکبر اور صحابہ رضی اللہ عنہم نے جن مرتدین سے جہاد کیا وہ صحیح تھا اور آپ حق پر تھے، اور شریعت کے کسی جزو کے منکر کے خلاف جہاد واجب ہو جاتا ہے۔ اس آیت میں ایک دلیل ان لوگوں کے خلاف بھی موجود ہے جو نعوذ باللہ صدیق اکبر ہی کو مرتد قرار دیتے ہیں۔ عقلی و شرعی دونوں صورتوں میں اگر ایسا ممکن ہوتا تو پھر یقیناً کسی ایسے مومن گروہ یا جماعت کا آنا نص قرآنی کی رو سے ضروری تھا جو غلبہ حاصل کرتی اور (ابوبکرؓ) اور ان کے ساتھیوں کو شکست دے کر اور ان سے جہاد کر کے اسلام و ایمان کا پرچم بلند کرتی۔ لیکن تاریخ کا بیان اس کے بالکل برعکس ہے اور کسی مومن گروہ نے آپ کے خلاف جہاد نہیں کیا، اور جن بھی مرتدین اور مانعین سے آپ نے جنگ کی اس میں غلبہ حاصل کیا، اور محض خدا کی مدد کے ذریعہ بے سروسامانی کے باوجود اپنی کامیابی کے یقین کے ساتھ آپ نے تمام مخالف طاقتوں کا مقابلہ کیا اور سال بھر کی قلیل مدت میں آپ نے جزیرۂ عرب کو تمام مرتدین، مدعیانِ نبوت، معطّلینِ شریعت اور مانعین زکوٰۃ کے فتنوں سے پاک کر دیا۔ یہ بات یقیناً نص قرآنی اور تاریخ کی روشنی میں صحیح ہے اور خلیفہ رسول اللہ کی خلافت پر اجماع امت کے بعد ایک اور زندہ و متحرک دلیل ہے۔

مرتدین سے جہاد کی شرطیں بھی وہی ہیں جو صدیق اکبرؓ نے واضح کی ہیں اور جن کا اشارہ قرآن پاک میں ملتا ہے یعنی یہ کہ مرتد کو توبہ کی مہلت دی جائے گی۔ صحیح ترین فقہی مذہب یہی ہے کہ مرتد کی توبہ قبول کی جائے گی اور اسے سوچنے

اور رجوع کرنے کی مہلت بھی دی جائے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ (بقرہ ۲: ۲۱۷) ترجمہ "اور جو تم میں سے اپنے دین سے پھر گیا، اور اس حالت میں مرا کہ وہ کافر ہو تو ایسے لوگوں کے اعمال دُنیا و آخرت میں ضائع ہو جائیں گے اور وہ آگ والے ہوں گے اس میں ہمیشہ رہیں گے"۔ آیت میں یہ تصریح کہ اس حالت میں مرے کہ وہ کافر ہو اس بات کی نشان دہی کرتی ہے کہ اگر وہ کفر سے توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی اور وہ کفر سے اسلام میں داخل ہو سکتا ہے اور آگ سے بچ سکتا ہے اور اس آیت کی روشنی میں فقہائے امت نے بحثیں کی ہیں جن کا خلاصہ یہی ہے کہ اکثریت کے نزدیک مرتد کی توبہ قبول ہوگی اور اس کو مہلت بھی دی جائے گی۔ یہ قول اسلام کی عدالت، جہنم سے بچانے اور سلامتی میں داخل کرنے کی صلاحیت، قرآن میں توبہ و مغفرت کے عام اصولوں کے موافق بھی ہے اور صدیق اکبرؓ کے عمل سے بھی ثابت و مسنون ہے۔ آپ نے مرتدین کے تمام گروہوں کے پاس جب فوج ارسال کی تھی تو توبہ کی شروط اس طرح واضح طور پر لکھ کر ارسال کی تھیں "میں تمہارے پاس یہ فوج ارسال کر رہا ہوں اور میں نے یہ حکم دیا ہے کہ کسی سے جنگ اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کو خدا کی طرف دعوت نہ دی جائے۔ جس نے اس دعوت کو قبول کیا، اسلام کا اقرار کیا اور ارتداد سے باز آیا اور عمل صالح کیا اس کی توبہ قبول کی جائے گی اور اس کی مدد کی جائے گی" (تاریخ طبری ۳-۲۵۱)۔ یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس کسی نے بھی توبہ کی اور دین کی طرف رجوع کیا صدیق اکبرؓ نے اور آپ کے سپہ سالاروں نے اس کی توبہ قبول کی اور اسلام کا دروازہ اس کے لیے کھولے رکھا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اسلام کی دعوت ہی کے لیے آپ نے جہاد کیا تا کہ وہ لوگ دوبارہ اسلام کے کُلی نظام میں داخل ہو جائیں۔ اکثر صدیق اکبرؓ کے مکاتیب اور احکام میں یہ جملہ بھی ملتا ہے کہ "اسلام کے سوا ان سے اور کوئی چیز قبول نہیں کی جائے گی" یہ صاف اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اور دوسری طرف یہ اس حقیقت کا اعلان بھی ہے کہ دین میں تجزیہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک کُل ہے جو ایک دوسرے کے ساتھ مضبوط طریقہ پر مربوط ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ادھورا اسلام قبول کیا جائے۔ نماز قبول کر لی جائے اور زکوٰۃ نہیں۔ توبہ کی قبولیت اور اسلام میں داخل ہو جانے کی دعوت اتنی عام تھی کہ غور کیجیے مشہور مدعیۂ نبوت سجاح بنت الحارث بن سوید بن عقفان التمیمیہ نے جب دعوئ نبوت چھوڑ کر دوبارہ اسلام قبول کر لیا تو طبری کی روایت میں ہے کہ "اس کا اسلام اچھا ہو گیا تھا" (تاریخ طبری ۳-۲۷۵)۔ ابن اثیر نے اپنی ایک روایت میں مزید یہ تصریح بھی کی ہے کہ وہ تغلب میں تھی تا آنکہ حضرت معاویہؓ نے عام الجماعہ میں ان کو بصرہ منتقل کیا۔ بنی تغلب کا اسلام اچھا ہو گیا تھا، اور سجاح بھی مسلمان ہو کر

اچھی مسلمان بن گئی تھی، بصرہ میں اس کا انتقال ہوا اور سمرہ بن جندب والی (گورنر) بصرہ نے اس کی نماز جنازہ پڑھائی" (الکامل ۲-۲۵۷)

جملہ مختصر یہ کہ کسی معلوم بالضرورت اور منصوص اسلامی عقیدہ کا انکار، یا دعوے، جیسے خدا یا نبی کا انکار، یا الوہیت و نبوت کا دعوے کرنے والا، یا شریعت کے جملہ احکام کو معطل کرنے اور نہ ماننے والا، یا شریعت کے کسی واجب یا حرام چیز کی حرمت یا حلت کا دعوے دار اسلام سے خارج ہو جاتا ہے اور حکومت وقت پر اس کے خلاف جہاد اس صورت میں واجب ہو جاتا ہے جب کہ وہ مہلت کے باوجود اسلام کی طرف رجوع نہ کرے اور توبہ نہ کرے۔

آخر الذکر دو گروہوں کے ساتھ اسلامی حکومت اور علماء کا رویہ

اگر اسلامی حکومت قائم ہو، اور اسلامی حاکم (خلیفہ) اسلامی اصولوں کی بنیاد پر حکومت کرتا ہو، اور اسلامی شوریٰ کا نظام قائم ہو تو آخر الذکر دونوں گروہوں کا وجود ہی نہ ہو۔ کیونکہ اسلامی نظام میں اسلامی افکار اور خصوصاً اسلامی قانون سے متعلق امور قرآن و حدیث و فقہ کے افاضل، مجتہدین امت اور قاضی (جج) ہی بیان کریں گے۔ اور جب تک ان میں شروط اجتہاد نہ پائی جائیں یا کم از کم وہ اسلامی علوم سے خاطر خواہ فیض یاب نہ ہوں ان سے خالص اسلامی قانونی مسائل میں کوئی مشورہ ہی نہ لیا جائے گا، خواہ وہ بدنیتی اور عدم اخلاص سے یہ کام کرنا چاہیں یا حسن نیت اور اخلاص سے۔ اور یہ کوئی ظلم و ستم نہ ہوگا اور نہ اسلامی فکر کو علماء و فقہاء کے گروہ میں محصور کر دینے والی تہمت اس پر صادق آئے گی۔ بلکہ یہ خالص ایک علمی و عقلی بات ہوگی۔ آج بھی دنیا کی بڑی سے بڑی جمہوری اور عوامی حکومتیں جو عوام کے نام اور حریت کی اقدار پر قائم ہیں جب کوئی قانونی مسئلہ سوچتی ہیں تو سب سے پہلے قانون کے ماہرین، ججوں اور وکیلوں کی خدمات حاصل کرتی ہیں۔ آپ نے کبھی یہ نہ سنا ہوگا کہ کسی جمہوری ملک میں جب قانون فوجداری بننے لگے تو عوامی حقوق اور فہم انسانی میں برابری وغیرہ کے نعروں اور دعووں کے پیش نظر ججوں اور وکیلوں کے بجائے شاعروں سے مدد مانگی گئی ہو چاہے کہ وہ غالب، میر، اقبال، ٹیگور، شکسپیئر، ورجل، ہومر، ہوگو اور فردوسی ہی کیوں نہ ہوں۔ یا جب قانون دیوانی کی تشکیل کا وقت آئے تو ڈاکٹروں کو اس کام کی دعوت دی جائے چاہے وہ بقراط، جالینوس، ابن سینا، ابن نفیس ہی کیوں نہ ہوں۔ یا اقتصادی نظریات اور مسائل کے لیے کوئی شخص آدم سمتھ، مل، کینز وغیرہ کی کتابیں چاہے وہ تنقیدی حیثیت ہی سے ہوں پڑھنے کے بجائے سائنسدانوں کے علوم پڑھنا شروع کر دے چاہے وہ گلیلو، کوپرنیکس، نیوٹن اور آئن سٹائن ہی کیوں نہ ہوں۔

جملہ مختصر یہ کہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ ہر علم و فن کے لیے کچھ شرطیں ہوتی ہیں اور طویل عمران علوم

میں گزارنے کے بعد بھی انسان ان پر پوری طرح قادر نہیں ہو پاتا، تو یہ کیسے ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی بھی علم میں بغیر صحیح معلومات کے دخل اندازی کرے، یا یہ دعوے کر دے کہ جنھوں نے اپنی عمریں کسی موضوع یا علم میں گزاری ہیں وہ اس کو صحیح نہیں سمجھتے اور میں اس کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس قسم کا دعوے کسی بھی علمی اور ریسرچ کے موضوع میں کرنے والے کو پاگل ہی تصور کیا جا سکتا ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اگر کوئی ڈاکٹر، انجینیرنگ میں سارے انجینیروں سے زیادہ، یا اس کے برعکس کوئی انجینیر ڈاکٹری میں سارے اسپیشلسٹ ڈاکٹروں سے زیادہ معلومات اور صحیح نتیجے، نقشے اور امراض کی تشخیص کا مدعی ہو جائے تو یقیناً عقل اور ہوش و حواس کی موجودگی میں کوئی شخص ان کے اس دعوے کو صحیح ماننا تو دور کی بات ہے سننا بھی گوارا کرے گا؟

بہرحال چونکہ خلیفہ اسلامی خود بھی مجتہد ہوتا ہے اور علماء و فقہاء اس کی مجلس شوریٰ میں ہوتے ہیں اس لیے کسی بھی فقہی اور قانونی مسئلہ میں انھی سے رائے اور مشورہ لیا جائے گا اور جن کے پاس ان موضوعات میں اجتہاد کی صلاحیت نہ ہوگی یا غیر متعلق ہوں گے ان سے کسی قسم کا نہ مشورہ لیا جائے گا اور نہ ان کو دین کے بارے میں اندازہ اور تخمینہ سے گفتگو کرنے کی اجازت ہوگی، اور اس طرح یہ دونوں گروہ صحیح اسلامی حکومت کی موجودگی میں پلٹتے ہی نہیں جائیں گے۔

اسلام علماء و فقہا کے طبقہ کے لیے مخصوص نہیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایک اہم نکتہ واضح کر دوں۔ وہ یہ کہ اس قسم کے جملے کہ "اسلام کسی خاص طبقہ یا گروہ کے لیے مخصوص نہیں" یا "اسلام صرف علماء و فقہاء کی میراث نہیں ہے" اکثر سننے میں آتے ہیں۔ یہ ایک حیثیت سے صحیح بھی ہیں، اور ان کا مقصد یہ ہے کہ اسلام میں یہ تفریق نہیں ہے کہ کاہن اولادِ ہارون کے لیے کچھ خاص احکام ہوں اور عوام کے لیے کچھ دوسرے احکام، یا علماء، فقہاء اور بزرگ خدا اور بندوں کے درمیان ایسا واسطہ ہوں کہ ان کے بغیر انسان دعا نہ کر سکتا ہو، اور جنت کا ٹکٹ نہ حاصل کر سکتا ہو۔ خدا بھلا کرے فقہاء کا۔ سرخسی نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جن لوگوں کی گواہی قبول نہ ہوگی ان میں "ایک وہ شخص بھی ہے جو الہام کو علم میں حجت مانتا ہو۔ کیونکہ وہ اس بنیاد پر کسی کے خلاف گواہی دے سکتا ہے۔" (المبسوط جلد ۱۶، کتاب الشہادات)۔ سبحان اللہ یعنی اسلام میں الہام، باطن وغیرہ کے نام پر علماء کو اپنی من مانی کرنے کی اجازت نہیں ہے، اور حجت صرف کتاب و سنت کے ظاہری اقوال ہیں جن کی روشنی میں استنباط و اجتہاد کرنے کے وہ لوگ مجاز ہیں جو اس کی صلاحیت رکھتے ہوں اور جب اس کی ضرورت ہو۔ اس لیے اسلام میں یہ نہیں ہے کہ عوام کے لیے پانچ نمازیں ہوں اور علماء کے لیے تین، یا عوام شریعت پر چلنے کے مکلّف ہوں اور خواص اس کے مکلّف نہ ہوں، بلکہ شریعت کے نام پر شریعت کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنے کی انھیں اجازت ہو، یا دینی تعلیم اور علوم سے کسی کو یہ کہہ کر رد کر دیا جائے کہ تم عالم کے بیٹے نہیں ہو، یا تم فلاں ذات سے تعلق رکھتے ہو، اور علم شریعت نہیں سیکھ سکتے۔ مطلب یہ ہوا کہ عمل کا دائرہ اسلام

میں سب کے لیے برابر ہے اور علم حاصل کرنے کی ترغیب ہر ایک کو دی گئی ہے اور اس کا دروازہ ہر ذات اور ہر قبیلے اور ہر قوم کے لیے کھلا ہوا ہے۔ لیکن اگر اس کا مطلب کوئی یہ نکالنا چاہے کہ علماء و فقہا کے علاوہ سب کو اسلام کی ترجمانی، اجتہاد، فتویٰ، تعلیم و تدریس کا حق ہے، اور بغیر عربی زبان جانے اور بلا علم حاصل کیے ہوئے متفق علیہ مسائل کو چھوڑ کر مختلف فیہ اور علمی مسائل میں مشورہ دینے اور لوگوں کو سکھانے کا انہیں حق ہے تو یہ ایک غلط اور نقصان دہ بات ہے اور اس سے فائدے معدوم اور فتنے متحقق ہیں۔ ہر مسلمان کو دین پر عمل کرنے کا نہ صرف حق ہے بلکہ یہ اس پر فرض ہے اور اگر تحقیقی علم نہیں رکھتا تو علماء سے رہنمائی حاصل کرنے کے بعد وہ شریعت پر عمل کرنے کا مکلّف ہے۔ لیکن اسلام کی ترجمانی، تدریس، افتاء، قضاء یہ سب وہ مناصب ہیں جن کے لیے کچھ شروط، اصول، مسائل، واجبات اور سنن ہیں۔ جب تک انسان ان کا حامل نہ ہو شرعی و عقلی طور پر اسے ان پر فائز نہیں کیا جا سکتا۔ مثال کے طور پر کسی شخص کو سورۂ فاتحہ اچھی طرح یاد نہ ہو تو اس کو امامت کے لیے کیسے آگے بڑھایا جا سکتا ہے؟ یا کسی کو فقہ پر عبور نہ ہو، اور فتویٰ دینے کا وہ اپنے آپ کو مجاز سمجھنے لگے، حدیث کی صحت، حسن و قبح اور ضعیف و موضوع کا، نیز قرآن کے ناسخ منسوخ، خاص و عام، مطلق و مقید اور دوسرے موضوعات کا متعلق علم نہ ہو، اور وہ بلا تکلف تقریریں کرنے لگے اور وعظ کی خدمات ادا کرنے لگے، یا تفقہ فی الدین کی بنیادی شرط اس میں نہ پائی جاتی ہو، اور وہ دین میں صرف اپنے آپ کو حق پر اور دوسروں کو باطل پر تصور کرنے لگے۔ ان سب مذکرہ بالا صورتوں میں صرف اس کی عقل کا فتور و قصور ثابت ہوگا، علماء و فقہاء و محققین و مجتہدین کی اس طرح نہ شان گھٹ سکتی، اور نہ ان کے تاریخی، علمی کارناموں اور اسلام کی حفاظت و دفاع و تبلیغ و اشاعت کی عدیم المثال اور شاندار کوششوں پر پانی پھیرا جا سکتا ہے، اور نہ اسلام کی ترجمانی کا شرعی و فقہی حق ان سے چھینا جا سکتا اور نہ کسی دوسرے کو دیا جا سکتا ہے۔ کاش سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خاں صاحب اپنی کتاب میں اس موضوع پر خامہ فرسائی کرنے سے قبل اس بدیہی حقیقت پر غور کر لیتے، اور کاش سارے اسلامی صدر، وزراء، قانون دان، پارلیمنٹ، تشریعی ادارے، جدید تعلیم یافتہ حضرات اس واضح اور سورج سے زیادہ روشن بات کو سمجھ لیں کہ اسلام کسی طبقہ کے لیے نہ مخصوص ہے اور نہ اس کی میراث و جاگیر، لیکن قانون اسلامی کے لیے اسلامی قانون کے ماہرین ہی کی مدد لی جائے گی جس طرح کسی بھی علمی موضوع کے لیے اس کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ اگر حسن نیت کے ساتھ اسلامی خدمت کا جذبہ کارفرما ہو تو اتنی واضح بات سمجھ میں آنی کوئی مشکل بھی نہیں۔

علمائے اُمّت کا کام جیسا کہ بیان کیا جا چکا اگر صحیح اسلامی حکومت قائم ہو تو اوّل اللذکر دونوں گروہوں کو حق کی طرف واپس لانے کی ہر ممکن کوشش کی جائے اور زبان و قلم سے آگے بڑھ کر اس معاملے میں شمشیر و سنان استعمال کرنے

سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ اور آخرالذکر دونوں گروہ وجود ہی میں نہ آئیں، اور اگر کسی طرح پیدا ہو بھی جائیں تو بہت جلد ان کا اثر ختم ہو جائے۔ لیکن جب خلیفہ موجود نہ ہو، یا صحیح اسلامی حکومت قائم نہ ہو، یا جہاں اسلامی اکثریت ہی نہ ہو، الغرض یہ کہ کسی بھی وجہ سے دین وشریعت کو نقصان پہنچانے والے یہ گروہ نمودار ہو جائیں تو اس صورت حال میں امت کے علماء، فقہاء اور شریعت کے محافظین کا یہ فریضہ ہو جاتا ہے کہ وہ صحیح اسلامی عقیدہ کا پرچار کریں، اور دین میں اصولی اور بنیادی عقائد، توحید، نبوت وغیرہ کی واضح تشریح کریں اور شریعت کے کلّی احکام اور دوامی ضرورت اور شریعت کے کسی حکم کے انکار سے پوری شریعت کے انکار کی کیفیت کو کھول کر بیان کر دیں تاکہ امت اوّل الذکر دو گروہوں کے شر سے محفوظ ہو جائے اور یہ بات اس پر عقلاً، شرعاً علم الیقین کے درجہ تک واضح ہو جائے کہ اسلام آخری دین ہے اور کمال دین اور اتمام نعمت کے بعد اب نہ کوئی دوسرا دین نازل ہو سکتا، نہ کوئی دوسرا رسول اور نہ کوئی دوسری شریعت نیز علماء کو آخرالذکر دو گروہوں کے نقصان سے اُمت کو بچانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ زندگی کے نئے سے نئے مسائل ومشاکل کے حل اور علاج کے لیے شریعت کے منصوص احکام کی موجودگی میں قیاس واستنباط واجتہاد کے ذریعے شریعت کی حفاظت وبقا اور جدت، تازگی اور ارتقا کا سامان بہم پہنچائیں جو الحمدللہ اہلِ علم واجتہاد پوری کوشش ومحنت کے ساتھ تمام دنیا میں کر رہے ہیں، جس کے لیے وہ یقیناً امت کی طرف سے مشکور اور خدا کی طرف سے ماجور ہوں گے، کیونکہ کسی بھی زندہ اور پائندہ شریعت کی علامت یہی ہے کہ تاقیامت کسی بھی موجودہ یا متوقع ضرورت، مشکل یا مسئلہ کا حل پیش کرنے سے وہ عاجز نہ ہو، اگر خدانخواستہ کسی مشکل کا حل شریعت کی روشنی میں کوئی نہ کر سکے تو شریعت کے عجز وقصور کی دلیل نہیں بلکہ اس شخص کے جمود ورجعیت، یا تمرد وآزادی کی دلیل ہے، شریعت مطہرہ زندہ اور منوّر شریعت ہے اور خالقِ انسان وکائنات کی اتاری ہوئی ہے اس لیے تاقیامت انسان کی ہر ترقی اور کائنات کی ہر تجلّی کا ساتھ دینے کی وہ صلاحیت رکھتی ہے اور جس طرح سورج کی روشنی اور حرارت کسی بھی سائنسی دور میں اپنی اہمیت اور ضرورت میں کمی نہیں پاتی اسی طرح شریعت کی روشنی اور نور تاقیامت ہر دور میں انسانیت کی صحیح رہنمائی کرتی رہے گی اور اس کو روشنی کا منارہ بن کر صراطِ مستقیم کی نشان دہی کرتی رہے گی، علمائے فقہ وشریعت کا کام یہ ہے کہ شریعت وفقہ کے استدلالی اصولوں اور عصر حاضر کے علمی طریقوں کے امتزاج کے ساتھ ان گروہوں پر نصوص الٰہیہ کی قطعیت، احکام الٰہیہ کی فرضیت، حدود الٰہیہ کا وجوب اور شریعت الٰہیہ کی فوقیت ثابت کر دے۔ متشککین کے اعتراض واقوال اگر حُسنِ نیت اور اخلاص کے ساتھ ہوں گے تو وہ عقل ومنطق اور دین وشریعت کی اس حجت بالغہ کو سن کر دُور ہو جائیں گے، اور ساتھ ہی ساتھ حیران وپریشان عوام بھی شریعت حقہ کی تمام خوبیوں، ہر زمانہ کا ساتھ دینے والی صلاحیت، عدل وعدالت

دونوں سے متصف ہونے کی خصوصیت، اور تمام انسانی قوانین پر فوقیت کا اندازہ خود صرف عقائدی تعبدی طور پر ہی نہیں بلکہ عقلی و علمی طور پر بھی کر لیں گے، اور بیسویں صدی کی سائنسی دنیا میں اور علم و ریسرچ کے ماحول میں شاید دین اسلامی اور شریعت الٰہیہ کی یہ سب سے بڑی، پائیدار اور نفع بخش خدمت ہو۔ و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

اسلام میں معیارِ فضیلت

(سیّد اسعد گیلانی)

ہر اجتماعیت میں فرد کے لیے ایک معیارِ فضیلت ہوتا ہے جس کو اختیار کر کے کوئی فرد شرف حاصل کرتا اور ترک کر کے ذِلّت سے دوچار ہوتا ہے۔ عالمگیر سچائیاں بلاشُبہ سب کے لیے اعزاز کا مشترک سرمایہ ہوتی ہیں، لیکن اِس معاملہ میں بھی اسلام اور کفر کے تصوّراتِ شرف و اعزاز اور معیارِ فضیلت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ فرق الٰہی ہدایات سے فیض یاب ہونے یا ان ہدایات سے محروم ہونے کا فرق ہے۔

الٰہی ہدایات سے محروم انسانی معاشرے میں فضیلت کا معیار ہمیشہ غیر معمولی صفات کی بنا پر رہا ہے۔ معمول سے بڑھی ہوئی ہر صفت نے انسانی ذہن کو ہمیشہ قوت سے اپنی طرف کھینچا ہے اور انسان اس کے ساتھ اپنے غیر معمولی جذباتِ عزت و نفرت یا خوف و حقارت وابستہ کرنے پر مجبور ہوتا رہا ہے۔ پُرانی تہذیبوں اور تاریخِ انسانی میں مختلف معاشروں کے تصوّراتِ عبودیت پر ہی اگر نظر ڈالی جائے تو عجیب و غریب قسم کے نو۲ کے مرتب ہو ہو کر سامنے آتے ہیں۔ یونانی علم الاصنام اور ہندو میتھالوجی کا سرسری سا مطالعہ بھی ہمارے سامنے ان پیچ در پیچ تصوّراتِ فضیلت کے معیار لاتا ہے جن کی تعداد کا گِننا ایک امرِ محال ہے۔ انسان کے لیے اپنے دَورِ جاہلیت اور بے شعوری میں ہر غیر معمولی چیز اور صفت کے آگے سرِ تسلیم خم کر دینا اس کا ایک عام طرزِ عمل رہا ہے۔ خدا کی ہدایت سے محروم کہانیاں غیر معمولی حسین، دلکش، قوی، نافع، مضر، خوفناک، بھیانک، وسیع، ہیبت ناک، جسیم، چمکدار، قیمتی اور نایاب چیز کے سامنے سرِ عبودیت جھکا دینا انسان کے دورِ جاہلیت کی ایک معمولی لیکن افسوسناک یادگار ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہندوؤں کے ہاں غیر معمولی صفات کی ہر چیز دیوتاؤں میں شامل ہوتی چلی گئی اور فضیلت کا یہ معیار اتنا وسیع ہوا کہ پھر پہاڑ، درخت، چوپائے، حسین عورتیں، ظالم مرد، آتش فشاں پہاڑ، دریا، بارش، ندی نالے، سمندر، چاند، سورج، ستارے، زمین اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ان کی ذہنی پستی سے سندِ فضیلت حاصل کر کے مقامِ ربوبیت پر فائز ہوتے چلے گئے۔ ان کے ہاں جو غیر معمولی آیا وہ دیوتا اور دیوی ہی بن کر رہا۔ یونانیوں کے ہاں بھی اسی طرح دیوی اور دیوتا بنتے رہے یہاں تک کہ ان کے اپنے آباء و اجداد جو ذرا نیک اور مشہور ہوئے وہ بھی ان کے صنم خانوں کی زینت بن گئے۔

یہ خالص مشرکانہ معیارِ فضیلت رہا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ بھی معرفتِ الٰہی کے جن تدریجی مدارج میں سے گزرے ہیں ان

مدارج میں بھی جھلکتی ہوئی اور بڑی چیز سندِ فضیلت کے ساتھ سامنے آئی۔

"هٰذَا رَبِّي هٰذَآ اَكْبَرُ" سے اس معیار کا اندازہ ہوتا ہے۔

پھر ہم مختلف معاشروں میں فضیلت کے اس معیار کو مختلف انداز اور مختلف رنگوں میں پاتے ہیں۔ قبائلی زندگی میں سب سے زیادہ فضیلت انہی کی رہی جو فنونِ سپہ گری میں طاق اور شجاعت میں بہادری میں نامور رہے۔ بعض لوگوں کے نزدیک کسی مخصوص خاندان یا برادری یا نسل میں پیدا ہونا وجہِ فضیلت سمجھا جاتا رہا۔ بعض نے کسی خاص قوم سے وابستگی، کسی خاص ملک کی پیدائش، کسی خاص خطۂ زمین سے تعلق کو وجہِ فضیلت قرار دے لیا۔ بعض نے رنگ کی سُرخی اور سفیدی، زردی اور سیاہی کو ہی انسانی بڑائی اور چھوٹائی، فضیلت اور کمتری کا معیار قرار دے لیا۔ بعض کے نزدیک کسی دریا کے پار کسی پہاڑ کی حد بندی یا کسی سمندر کے کنارے کی رہائش ہی بزرگی کے لیے دلیل بن گئی۔

پھر ملوکیت کے دور سے گزر کر آج کی سرمایہ دارانہ جمہوریتوں میں اب فضیلت کا پیمانہ زر ہو گیا ہے۔ کاریں، بنگلے، بھاری بنک بیلنس، کلبوں کی ممبریاں، پارٹیوں کی شرکت، اور روپے کی ریل پیل میں رہنا ہی وجہِ افتخار بن گیا۔ اور کسی کے گھٹیا سمجھے جانے کے لیے یہ بہت کافی قرار پایا کہ اس کے پاس عمدہ سے عمدہ سوٹ نہ ہوں اور وہ بہتر سے بہتر ہوٹلوں میں دوستوں کو دعوت نہ دے سکتا ہو۔ اور نہ ہی آج کی زرکشی کی تفریحات اور روپے کی ریل پیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے سکتا ہو

پھر انہی سرمایہ دارانہ لادینی جمہوریتوں میں علم و فن کے اس استعمال کو بھی قابلِ فخر اور موجبِ افتخار سمجھا جاتا ہے کہ آدمی پوری خوبصورتی سے جھوٹ بول سکتا ہو، اور اس جھوٹ کو سچ کے لبادے میں پیش کرنے کی مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔ مکاری اور عیاری میں طاق ہو۔ فریب اور دھوکے میں یدطولیٰ رکھتا ہو۔ وعدہ صرف اس لیے کرے کہ اسے پورا کرنا مقصود نہ ہو، اور اخلاقی اقدار اس کے نزدیک محض اضافی حیثیت رکھتی ہوں۔ ایسا شخص ایک عمدہ ڈپلومیٹ اور معزز سیاست دان سمجھا جاتا ہے اور اس کا یہ حق ہو جاتا ہے کہ وہ قومی اور ملکی معاملات میں ماہرانہ، قائدانہ اور لیڈرانہ حصہ لے اور قوم اور ملک کی رہنمائی کرے۔

جدید تصورِ قومیت میں آج نسل، رنگ، وطن اور زبان کو مستقل معیارِ فضیلت بنا لیا گیا ہے اور ان معیاروں کی اوٹ میں ہر گورے کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ کالے اور زرد پر بم گرا کر ختم کر دے۔ ہر قوم کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسری قوم کے زن و مرد کو توپوں سے اُڑا دے۔ ہر ملک کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسرے

ملک کی زمینوں اور باغات کو آگ میں جھونک دے۔ اور ہر زبان بولنے والے کو حق حاصل ہو گیا ہے کہ وہ دوسری زبان بولنے والوں کو کمتوں سے بھی بدتر سمجھے۔ اگر ہم ان معیاروں کو عقل کی کسوٹی پر پرکھیں تو ان کا کھوٹ پوری طرح کھل کر سامنے آجاتا ہے۔ اگر کوئی شخص گز بھر زمین پر پیدا ہونے کے باوجود کئی ہزار مربع میل کے رقبے کو اپنا وطن قرار دے لیتا ہے تو وہ اسی دلیل کی رو سے سارے کرۂ ارضی کو اپنا وطن کیوں نہیں قرار دے سکتا؟ اگر ایک ہی خیال مختلف زبانوں میں ادا ہو سکتا ہے اور مختلف زبانیں بولنے والے اس ایک خیال پر متفق ہو سکتے ہیں تو پھر زبان کو افتراق و جدائی کا مظہر قرار دینا بہت بڑی کوتاہی ہے۔ انسان میں اصل قوتِ کار اس کی روح ہے جسم نہیں۔ اور روح کا کوئی رنگ نہیں ہے۔ جس طرح ہم سُرخ اور سفید گائے کے دودھ میں فرق نہیں کرتے اسی طرح کالے اور گورے انسان میں بھی اس کے رنگ کی بنا پر فرق کرنا سب سے بڑی کوتاہ بینی ہے۔ اسی طرح نسل کا افتخار بے معنی ہے۔ اگر ہم نسل کے سلسلے کو آخری حدود تک لے جائیں تو سب انسانوں کے رشتے ان کے پہلے باپ اور ماں سے جا ملتے ہیں۔ اس طرح فضیلت کے ان معیاروں کا کھوکھلا پن کھل کر سامنے آجاتا ہے۔

اسی لیے فضیلت کے ان لاتعداد معیاروں کے ڈھیر پر اسلام یک قلم خطِ تنسیخ کھینچ دیتا ہے۔ وہ اپنا ایک نرالا فلسفۂ فضیلت اور نرالا ہی معیارِ بزرگی رکھتا ہے وہ تمام پیچ در پیچ اور فضیلت کے ان بودے پیمانوں کو توڑ کر اپنا الگ پیمانہ پیش کرتا ہے۔ وہ عین اس عالمِ وجود کے وسط میں حیاتِ انسانی کے سینے پر اپنا میزانِ فضیلت گاڑ دیتا ہے۔

إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقٰكُمْ (تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ سے ڈرنے والا ہے)

حضورؐ نے فرمایا "پرہیزگاری کے سوا اور کسی چیز کی بناء پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت نہیں ہے۔ سب لوگ آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنے تھے"

فرمایا "نہ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت ہے اور نہ عجمی کو عربی پر۔ تم سب آدم کی اولاد ہو" فتح مکہ کے موقع پر فرمایا "سن رکھو کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ، خون اور مال کا ہر دعویٰ، آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے"

پھر فرمایا۔

"اے لوگو تم سب آدم کی اولاد ہو، اور آدم مٹی سے بنے تھے، نسب کے لیے کوئی فخر نہیں ہے، عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر کوئی فخر نہیں ہے، تم میں سب سے زیادہ معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"

اسلام نے فضیلت کے تمام غیر الٰہی نظریات کو توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ نسل کے بُت پر اس نے یہ کہہ کر ضرب

لگائی۔

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ	"خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا
مِنْهَا زَوْجَهَا وَ بَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا	پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان
كَثِيْرًا وَّ نِسَاءً (النساء)	دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں
	کو دُنیا میں پھیلا دیا"

مزید ارشاد ہوا۔

"اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت تم میں سب سے معزز وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (سورہ الحجرات)

حضورؐ نے فرمایا:

"جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے۔"

مزید فرمایا: "وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو لوگوں کو عصبیت کی طرف بُلاتا ہے۔"

غرض بحیثیت انسان اور آدم کی اولاد ہونے کے اسلام میں کسی شخص کو کسی دوسرے شخص پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔ اسلامی معاشرے میں انسان کے بنیادی حقوق سب کے لیے مساوی اور برابر ہیں۔ اسلامی نظام میں کسی کے بچوں کو اس لیے بہترین تعلیمی اور رہائشی سہولتیں میسر نہیں آسکتیں کہ وہ بچے امیرالمومنین کے بچے ہیں اور کسی کے بچے صرف اس لیے گلیوں میں خاک چھانتے نہیں پھر سکتے کہ وہ کسی غریب کی اولاد ہیں۔ اسلام میں ہر فرد کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ وہ تمام امتیازات سے قطع نظر اپنا انسانی حصہ وصول کرے اور اپنے طبعی جسم کو برقرار رکھنے کے لیے اپنی ضروریات کو حاصل کرے۔ ریاست کے قانون میں دونوں کی حیثیت یکساں ہے۔

خاندان اور قوم کے فخر کے غباروں میں سے بھی اسلام نے ہوا نکال دی ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "اے عبدالمطلب کی اولاد اپنے نفسوں کو آگ سے چھڑاؤ کیونکہ میرا رشتہ تم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔" پھر فرمایا "اے محمدؐ کی بیٹی فاطمہؓ دوزخ سے چھٹکارا پانے کی کوشش کر، کیونکہ میرا رشتہ تجھ کو خدا کے ہاں مفید نہیں ہو سکتا۔"

لیکن اگر کچھ مفید ہو سکتا ہے اور جو کسی کے لیے وجہِ فضیلت بن سکتا ہے۔ تو وہ "تقویٰ" ہے چنانچہ اسلام کے ہر داعی حضرت نوحؑ حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت لوطؑ سب نے اپنے اپنے

دور میں اپنی اپنی قوم کو اللہ کی عبادت اور اس کے تقویٰ کی طرف ہی بلایا۔

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ "اے میری قوم اللہ کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارے لیے اور کوئی معبود نہیں"

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہی حکم ہوا۔ "اے چادر لپیٹنے والے کھڑا ہو، اور لوگوں کو ڈرا۔"

چنانچہ اللہ کی عبادت اور بندگی ہی وہ ایک معیار ہے جو انسان اور انسان میں فرق پیدا کرتی ہے۔ بحیثیت انسان کے ایک کافر بھی اور ایک مومن بھی، ایک سرکش بھی اور ایک اطاعت گزار بھی دونوں خدا کے بندے ہیں۔ لیکن بحیثیت بندوں کے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ عبادت کا مطالبہ صرف رکوع و سجود اور تسبیح و تہلیل تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ مطالبہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ بھی خدا کی اطاعت اور بندگی سے باہر نہ ہو، اور خدا کی عین مرضی کے مطابق کام کرے۔ انفرادیت اور شخصیت ہی نہیں بلکہ اجتماعیت میں بھی انسان کی سیاست، معیشت اور معاشرت کی گاڑی اسی کی اطاعت کی پٹڑی پر چلے۔

اس انفرادی اور اجتماعی عبادت کو بجا لانے کے سلسلے میں جس سعی و جہد، جس ذوق و شوق، جس عشق و محبت، جس وارفتگی اور جان نثاری کا اظہار کسی شخص سے ہوگا اسی قدر فضیلت کے ترازو میں اس کا وزن زیادہ نکلے گا۔

لیکن عبادت کو خالص اور زندگی کے ہر پہلو پر صبر و ثبات سے حاوی کرنے کے لیے جس چیز کی ضرورت ہے وہ ایمان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات پر پورا یقین و اذعان ہونا، اس کی رزاقی پر مکمل بھروسہ، اس کے عالم الغیب ہونے پر کامل یقین، اس کے رحیم و کریم ہونے پر اعلیٰ درجے کا توکل، اس کے مالک یوم الدین ہونے پر سچے دل سے پختہ یقین، اس کے احکام پر عمل کرنے کا انتہائی ذوق و شوق اور ان سے انحراف کرنے سے شدید خوف و ہراس، اس کی حرام کردہ چیزوں سے کلی اجتناب، اور اس کے اوامر پر عمل کرنے کی بے انتہا لپک، اس کی پسند کو دل سے اپنی پسند سمجھنا، اور اس کی ناپسند کو اپنی روح کی گہرائیوں سے ناپسند کرنا، اس کی وفاداری کے مقابلے میں دوسری تمام وفاداریوں کو ہیچ سمجھنا۔ اور اس کی اطاعت کو تمام اطاعتوں پر حاوی کر دینا، غرض ایمان کی ان ٹھوس بنیادوں پر عمل کو استوار کرنا ہی حقیقی مسلم ہونا ہے۔ اللہ کے حکم کے تحت کسی سے جڑ جانا اور اسی کے حکم کے تحت کسی سے کٹ جانا، اور عمل کے ہر گوشے سے اس بات کا اظہار ہونا کہ اس کے دل و دماغ کے کسی کونے میں غیر الٰہی محبت و اطاعت کا کوئی بُت باقی نہیں رہا ہے۔ مسلم ہونے کی ان ضروری شرائط کے ساتھ جب اللہ کے ڈر اور خوف کی اتنی آمیزش ہو جائے کہ انسان ہر دم اس کے احکام پر عمل کرنے کے لیے کمر بستہ رہے، اس کے ہر فعل سے مکمل اطاعت خداوندی کا اظہار ہو، اس میں خدا کے ہاں جواب دہی کا احساس ایک جیتا جاگتا جذبہ

اور ایک مُنہ بولتی حقیقت ہو، اس کی حس اتنی تیز ہو کہ وہ خدا کے حکم سے خفیف سے خفیف غیر شعوری انحراف کو بھی اپنے نفس کی تہ میں جانچ لے اور اسے وہیں قتل کر دینے پر آمادہ رہے، وہ پوری ذمہ داری سے اپنی زندگی کا بار بار جائزہ لے اور ہر گھڑی محاسبہ کرے کہ اس کی کوئی حرکت منشائے الٰہی کے خلاف نہ ہو، تو اسی کیفیت کا نام تقویٰ ہے اور اسی پر فرمایا گیا ہے کہ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ اسی تقویٰ کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے معیارِ فضیلت قرار دیا ہے اور اسی کیفیت کو سندِ بزرگی عطا کی گئی ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اللہ کی ناراضگی سے بچو۔ جو خدا کے غضب سے ڈرتا ہے وہ پورا پورا کامیاب ہوا۔ پرہیز گاری مراتب کو بلند کرتی ہے۔"

فرمایا: "مبارک ہے وہ شخص جس کے اخلاق اچھے ہوں، دل پاکیزہ ہو، اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رکھے۔"

ایک جگہ آپ نے مُنصف، سخی اور نیک حاکم کو جنتی قرار دیا۔ رشتہ داروں اور مسلمانوں کے ساتھ مہربانی کرنے والے نرم دل آدمی، عیالدار، باعفت اور سوال سے بچنے والے کو بھی جنت کی خوشخبری دی۔ اس لیے کہ یہ صفات تقویٰ کی ضروری شرائط ہیں۔ کمزور، بے شعور، آوارہ گرد، خیانت کرنے والے اور دھوکہ دینے والے کو دوزخ کی وعید سنائی گئی اس لیے کہ یہ صفات تقویٰ کی عین ضد ہیں۔

پھر فرمایا "جس کو آخرت کا خیال ہو اللہ اس کے سارے کام درست کر دے گا اور جو دُنیا کے غم میں پریشان ہوا اللہ اس کے سارے کام پراگندہ کر دے گا۔"

فرمایا "معاہدوں کو پورا کرو۔ خدا پرہیزگاروں کو دوست رکھتا ہے۔"

فرمایا "جاہلیت کے تمام مفاخر بند کیے جاتے ہیں۔"

ایک موقع پر فرمایا "خدا کے نزدیک معزز وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔"

اسلام کے پیشِ نظر صالح افراد کو چن چن کر اوپر لانا ضروری ہے تاکہ وہ دنیا میں اصلاح کریں اور امن قائم کریں اور انسانوں کو انسانیت کا سبق دیں۔ تقویٰ کے اس معیار پر اگر ایک حبشی بھی پورا اترتا ہے تو وہی اوپر آنے کا حق دار ہے۔ حضورؐ نے فرمایا "سنو اگر تم پر نکٹا حبشی بھی امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے مطابق تمہیں چلائے تو اس کی بات ماننا اور اطاعت کرنا۔"

پھر کسی فاجر کی قیادت قبول کرنے سے بھی منع فرمایا "کوئی اجڈ گنوار کسی مہاجر کا امام نہ بنے اور نہ کوئی فاجر شخص کسی پارسا مومن کا۔"

قرآن میں فرمایا گیا۔

لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ	"اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی دوست اور
اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ	محبوب نہ رکھو۔ اگر وہ ایمان کے مقابلے میں
عَلَى الْاِيْمَانِ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ	کفر کو محبوب رکھیں اور تم میں سے جو کوئی
مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔	ان کو محبوب رکھے گا وہ ظالموں میں شمار ہوگا۔"

فرمایا گیا "جو اپنے عہد کو پورا کریں اور اللہ تعالیٰ سے ڈریں تو اللہ ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔"

حکم ہوا "اے محمدؐ کہو کہ میری نماز اور میرے تمام مراسمِ عبودیت، میرا مرنا اور جینا سب کچھ اللہ کے لیے ہے اور سب سے پہلے میں اس کی اطاعت میں سرِ تسلیم خم کرتا ہوں۔"

حکم ہوا "اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو کہ تمہیں اس سے ملنا ہے" (سورہ بقرہ)۔ "اللہ سے ڈرو وہ جلد حساب چکانے والا ہے" (سورہ مائدہ)

یہ احکام انسان کو اس کے معیارِ فضیلت کی طرف بلاتے ہیں چنانچہ اس معیار سے ہٹ کر اگر کوئی یہ سمجھے بیٹھا ہو کہ وہ فلاں خاندان سے تعلق رکھتا ہے اس لیے اسے جہنم کی آگ نہ چھوئے گی یا فلاں بزرگ سے اس کا رشتہ ہے اس لیے وہ اسے بچا لیں گے یا محض مسجد بنوا کر یا عید میلاد کا جلسہ کروا کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ اس نے تقویٰ کا حق ادا کر دیا اور پھر اپنی ساری زندگی کو بکری کے لیے لیے پھرے اور جو جس طرح چاہے اس کی زندگی کو چند ٹکوں کے عوض استعمال کرے تو اس قسم کا فالج زدہ تقویٰ تو شاید ہی خدا کی میزانِ عدل میں کوئی وزن پا سکے۔ اصل تقویٰ تو وہی ہے کہ انسان کی زندگی کا اندر اور باہر ان حدود کے اندر رہے جو خدا اور اس کے رسولؐ نے مقرر فرما دی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت اُبیؓ بن کعب سے تقویٰ کا مفہوم پوچھا۔ انہوں نے فرمایا "امیر المومنین آپ کسی ایسے راستے سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف خاردار جھاڑیاں ہوں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "ہاں"

حضرت اُبیؓ نے پوچھا "آپ وہاں سے کیسے گزرتے ہیں؟"

حضرت عمرؓ نے فرمایا "دامن کو سمیٹ کر اور بچا کر گزر جاتا ہوں۔"

حضرت اُبیؓ نے فرمایا "یہی تقویٰ ہے۔"

یعنی انسان خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے بچ بچ کر حدودِ شریعت کے اندر رہتا ہوا زندگی گزارے۔ اس

طرح اسلام نے فضیلت و بزرگی کے تمام جاہلی پیمانوں کو توڑ پھوڑ دیا اور اپنے نئے معیارِ فضیلت پر جو سوسائٹی تعمیر کی اس میں ایران کے سلمانؓ بھی تھے جو اپنے آپ کو ابنِ اسلام کہتے تھے اور جن کے متعلق حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ فرمایا کرتے تھے کہ سلمانؓ ہم اہلبیت میں سے ہیں۔ ان میں باذانؓ بھی تھے جن کا نسب شاہانِ ایران سے جا ملتا تھا۔ ان میں حبشہ کے بلالؓ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ "بلال ہمارے آقا کے غلام اور ہمارے آقا ہیں"۔ ان میں روم کے صہیبؓ بھی تھے جنہیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ امامت کے لیے کھڑا کیا تھا۔ ان میں حضرت ابو حذیفہؓ کے غلام حضرت سالمؓ بھی تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے انتقال کے وقت فرمایا کہ "آج وہ زندہ ہوتے تو میں انہیں خلافت کے لیے نامزد کرتا"۔ ان میں زیدؓ بن حارثہ ایک غلام بھی تھے جن سے رسول کریمؐ نے اپنی پھوپھی کی لڑکی کو بیاہ دیا تھا۔ ان میں حضرت زیدؓ کے بیٹے حضرت اسامہؓ بھی موجود تھے جنہیں رسول کریمؐ نے ایسے لشکر کا سردار بنایا تھا جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ جیسے صحابہ کبار موجود تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے سے فرمایا تھا کہ "اسامہ تجھ سے اور اس کا باپ تیرے باپ سے افضل ہے"۔

فتح مکہ کے موقع پر خود قریش نے قریش پر غلبہ حاصل کیا تھا اور ایک اعلیٰ تر مقصد کے لیے خود اپنوں کو مغلوب کیا تھا۔

ایک غزوہ میں عبداللہ بن اُبَی مشہور منافق نے کہا، بخدا مدینہ پہنچ کر جو ہم میں عزت والا ہوگا وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا"۔ اور جب اس بات کی خبر اس کے لڑکے حضرت عبداللہؓ کو ہوئی تو انہوں نے مدینہ پہنچ کر باپ کا راستہ روک لیا، اور تلوار سونت کر کہا کہ "تو مدینہ میں نہیں گھس سکتا جب تک رسول اللہؐ اجازت نہ دیں، تو کہتا ہے کہ جو عزت والا ہے وہ ذلت والے کو نکال باہر کرے گا تو تجھے معلوم ہو کہ عزت صرف اللہ اور اس کے رسولؐ کے لیے ہے"۔ حضورؐ کے حکم پر ہی انہوں نے اپنے باپ کو شہر میں داخل ہونے دیا۔

ایک موقع پر جب کہ حضورؐ قریش کے کچھ سرداروں کو دعوتِ اسلام دے رہے تھے اور اس مجلس میں ابوجہل، عتبہ اور شیبہ جیسے اکابرِ قریش بھی تھے کہ حضرت ابنِ مکتومؓ نابینا صحابی تشریف لائے اور حاضرین کو نہ دیکھ سکنے کی وجہ سے حضورؐ کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا۔ حضورؐ نے سردارانِ قریش کو دعوتِ اسلام دینے کے خیال سے حضرت ابنِ مکتومؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس پر تادیبی آیات نازل ہوئیں۔

یہ تھا وہ معاشرہ جو اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ کے اصول پر تعمیر ہوا تھا اور جس اصول پر اگر کوئی اسٹیٹ وجود میں آتا ہے تو اس کے کارکن، اس کے جج، اس کے حاکم اور اس کے چپڑاسی تک بالکل مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں حتیٰ کہ آج کا ایک جج بھی اپنے موجودہ اخلاق کے ساتھ اسلامی عدالت کا کلرک اور چپڑاسی کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اسلام جاہلی برعکس ہوئی اچھائیوں اور نیکیوں کو معروف کا نام دے کر ان پر انسان کو اکساتا ہے

اور جو لوگ اس مقصد کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں انہیں بھلے آدمی اور متقی قرار دیتا ہے اور اسی طرح جانی بوجھی ہوئی بُرائیوں کو مُنکر کا نام دے کر انسانوں کو ان سے روکتا ہے اور ان کا ارتکاب کرنے والوں کو بُرے لوگ اور فاسق و فاجر قرار دیتا ہے۔ یہی وہ میزانِ فضیلت ہے جو اسلام نے زمانے کے سینہ میں ہمیشہ کے لیے گاڑ دی ہے۔ اور جسے اسی لیے تا قیامت قائم کر دیا گیا ہے تاکہ بنی نوع انسان اس میں اپنے آپ کو تول سکیں۔ اسی میں تول کر اپنے حاکموں اور نمائندوں کو مقرر کریں۔ اسی میں تول کر وہ کسی کو معزز قرار دیں اور کسی کو گرا ہوا سمجھیں۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے اسی میزان کو اپنے درمیان سے اکھاڑ دیا جو خیر اُمتہ کے مخاطب تھے اور جنہیں شہداء علی الناس کا منصب دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اگر دُنیا گمراہی میں میلوں دُور نکل گئی تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ جب رہنما ہی منزل کھو بیٹھے تو راہرو کی منزل سے دوری حیرت انگیز نہیں ہے۔ اسی میزانِ فضیلت سے ہٹ کر دُنیا نے نسل اور رنگ اور وطن اور زبان کو قومیت کی بنیاد بنایا اور پھر اسی بناء پر ہزاروں جنگیں لڑی ہیں اور تباہیوں کے سیل کے سیل امنڈ امنڈ کر آئے ہیں۔ اور انسانیت کو خاک و خون میں بہا کر لے گئے ہیں۔ نسلِ انسانی نے ہزار بار تباہی کا سامنا کیا ہے اور ہر بار وہ پھر اسی تباہی کے منبع کی طرف لپک لپک کر گئی ہے۔ اس لیے کہ امن و عدالت اور راستی و صداقت کے ترازو میں انسانوں کا تُلنا موقوف ہو گیا ہے اور فضیلت کے پیمانے اب بھی وہی رائج ہو گئے ہیں جو ہمیشہ سے گُم کردہ راہ انسانوں کے من بھاتے پیمانے رہے ہیں، جو جاہل عصبیت کے ترازو ہیں۔ ان ترازوؤں میں تُل تُل کر انسان ایک دوسرے پر ایٹم بم اور مشین گنیں لے کر دوڑتے ہیں اور ہر وقت تاک میں لگے رہتے ہیں کہ کب ان کا داؤ لگے اور وہ حریف کے کیمپ کو شعلوں کے حوالے کر دیں۔

اس عصبیت اور قوم پرستی نے ایسے لوگ جو سب سے زیادہ شریر، فسادی، ناخدا ترس، مکّار و شاطر، وعدہ خلاف اور فریبی تھے۔ ہر جگہ اور ہر قوم میں انسانی گروہوں پر مسلط کر دیے ہیں۔ چنانچہ آج ہم دیکھتے ہیں کہ شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک زمین کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں ایسے بھیڑیے اور ڈاکو اقتدار کی باگیں ہاتھوں میں نہ لیے بیٹھے ہوں جن کے ذہن دن رات یہی سوچنے میں مصروف ہیں کہ وہ کس طرح دنیا پر آگ کی بارش کر سکیں اور کس طرح انسانوں کی پوری پوری آبادیاں ایک ہی وار میں ہلاک کر سکیں۔ جن کی ایجادات کا سب سے بڑا کمال انسانوں کو ہلاک کرنا، زیادہ سے زیادہ تباہ کرنا، اور انتہائی سرعت سے ختم کرنا ہو۔ جن کی سائنس نے اب تک سب سے بڑے کمالات ہلاکتِ انسانی ہیں ہی دکھائے ہوں۔ جن کی تہذیب ہلاکت، بناوٹ اور دکھاوے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ جن سے بڑا ظالم اور خونخوار ڈاکو آج تک زمانے میں نہیں پیدا ہوا اور جن سے بڑا مردم خوار بھی

کوئی نہیں ہوا۔ جو سب سے بڑے درندے اور بھاری قاتل ہیں۔ آج دنیا کی سربراہی انہیں کے ہاتھوں میں ہے۔ امریکہ میں وہ ایٹم بم بنا رہے ہیں اور روس میں وہ خلائی جہاز تیار کر رہے ہیں کہ کب دنیا میں آگ و خون کا کھیل شروع ہو، اور وہ اپنے اپنے ہتھیاروں سے لیس ہو کر ایک بار پھر دُنیا کو جہنم زار بنا دیں۔ یہ صرف اس لیے ہے کہ اسلام کی پیش کردہ میزانِ فضیلت گر گئی ہے اور اس میں دُنیا کی قومیں تو الگ رہیں خود مسلمانوں نے بھی اپنے آپ کو اور اپنے اکابرین کو تولنا چھوڑ دیا ہے۔ اس میزان کی عدم موجودگی نے دنیا کی سب سے اونچی صف میں سب سے زیادہ خونخوار اور بد اخلاق لوگوں کو جمع کر دیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ زمانے کا دامن ایسے لوگوں سے کبھی خالی نہیں رہا ہے جنھوں نے بار بار اس میزانِ فضیلت کو قائم کرنے کی جد و جہد کی ہے۔ حضرت امام حسینؓ نے دیکھا کہ اسلام کے نظامِ امامت میں تقویٰ کی میزان گرا کر اس کی جگہ نسل کا معیار قائم کیا جا رہا تھا اور اگرچہ اس وقت قرآنی قوانین ریاست کا آئین تھے۔ تمام فیصلے شریعت کے ماتحت ہی ہوتے تھے لیکن امام حسینؓ انسانوں کے درمیان فضیلت کے ترازو کا اتنا سا جھکاؤ بھی برداشت نہ کر سکے اور کربلا کے میدان میں نسلی اور خاندانی فضیلت کی جاہلیت کو چیلنج کر دیا اور اپنے بہتّر پاکباز ساتھیوں کے ساتھ فلاحِ انسانیت کے اس سنہری اصول کے لیے جان دے دی۔

منصور عباسی کے دَور میں کوڑوں کی مار نے امام ابوحنیفہؒ کا خون ایڑیوں تک تو بہا دیا لیکن انہوں نے فضیلت کے لیے تقویٰ کو ہی معیار قرار دیا۔ امام احمد بن حنبل بیس سال تک مسلسل مار کھاتے رہے اور شدید سزائیں بھگتتے رہے لیکن انھوں نے حق کو اس لیے نہیں چھوڑ دیا کہ اس کی مخالفت ایک بادشاہ کی طرف سے کی جا رہی تھی۔ اسی معیار کے قیام کے لیے امام ابن تیمیہؒ نے جیل میں جان دے دی۔ ابراہیم نخعیؒ اسی معیارِ فضیلت کا اظہار کر کے منصور عباسی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ نے اسی معیارِ فضیلت کو قائم کرنے کے لیے جہانگیر کی جیل میں دن رات گزارے۔ امام غزالیؒ نے تو بادشاہ کے روبرو صاف صاف کہہ دیا "تیرے گھوڑوں کی گردن سازِ زریں سے نہ ٹوٹی تو کیا ہوا؟ مسلمانوں کی گردن تو فاقہ کشی کی مصیبت سے ٹوٹ گئی۔"

اسی میزانِ بزرگی کو پھر نصب کرنے کے لیے بالاکوٹ کے شہیدوں نے جانیں دیں۔ آج اسی میزانِ فضیلت کو قائم کرنے کا دعوےٰ لے کر جو لوگ اس ملک میں کام کر رہے ہیں ان کی دعوت یہ ہے کہ دُنیا کی باگ ڈور جو فساق و فجار کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے یہی تمام فتنوں کا منبع ہے۔ وہ تمام بندگانِ خُدا کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوں۔ ایک نصب العین کے ساتھ اپنی تمام قوتیں لے کر اٹھیں اور دُنیا کی باگ ڈور ان لوگوں کے ہاتھوں سے چھین لیں جن کے ہاتھوں

میں اقتدار کا رہنا دنیا کی تباہی ہے۔ وہ ہاتھ چاہے غیر مسلموں کے ہوں جن کے لیے سب کچھ حلال ہے اور چاہے مسلمانوں کے ہوں جنہوں نے اپنے لیے ہر حرام کو حلال کر لیا ہے۔ بہرحال اب دُنیا کے امن کے لیے اور فلاحِ انسانیت کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے کہ وہ لوگ آگے آئیں جو خُدا سے ڈرنے والے اور آخرت میں جواب دہی کا پورا پورا احساس رکھنے والے ہوں، جو نیک اور صالح ہوں۔ اور وہ لوگ پیچھے ہٹیں جنہوں نے اپنی ہوس کے سامنے فتنوں کے سارے دروازے کھول رکھے ہیں اور جن کے دماغوں کو شیطان نے اپنا گھونسلا بنا رکھا ہے۔ اگر دُنیا کو تباہی کی طرف جانے سے روکنا ہے اور اگر خدُا کی زمین کو انسانی خون سے لالہ زار ہونے سے بچانا ہے۔ اگر مسلمانوں میں اپنے معروف کے علمبردار ہونے اور منکر کے ختم کرنے والے ہونے کا احساس باقی ہے اور خدُا کے ہاں جوابدہی کا تصور بھی موجود ہے تو پھر کرنے کا کام یہی ہے کہ وہ لوگ جو خدا کی مقرر کردہ اس میزانِ فضیلت کو قائم کرنا اپنا فرض سمجھتے ہوں وہ اس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ جس دن یہ ہو گا اس زمین پر خدُا کی مرضی اُسی دن پوری ہو گی۔

(بقیہ اشارات) اس اصول کی روشنی میں آپ ذرا موجودہ اضطراب اور تبدیلی کے محرکات کا جائزہ لیجیے اور دیکھیے کہ کیا ان میں نظامِ حیات کی تبدیلی کی کوئی شدید آرزو موجود ہے؟ کیا موجودہ حکومت سے لوگ اس لیے بدظن ہیں کہ وہ ان پر ایک ایسا نظام مسلط کر رہی ہے جو اُن کی ملی آرزوؤں سے مغائرت رکھتا ہے؟ یا اُن کا حکومت کے خلاف واویلا محض اس لیے ہے کہ اُس کی بدانتظامی کی وجہ سے ملک کے اندر کمر توڑ مہنگائی نے عوام کی زندگی کو سخت عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے؟ اگر حکومت کے خلاف ہر آن بڑھتی ہوئی نفرت وحقارت کی وجہ محض مہنگائی ہے تو قیادت کے اندر کسی خوشگوار تبدیلی کی توقع بالکل عبث اور بیکار ہے۔ کیونکہ حکومت اپنے وسیع ذرائع کی مدد سے مصنوعی ارزانی پیدا کر کے ہر فیصلہ کُن مرحلے پر عوام کو یہ دھوکہ دے سکتی ہے کہ ان کا یہ مسئلہ خاطر خواہ طور پر حل کر دیا گیا ہے۔ لیکن اگر نفرت وحقارت کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ قیادت اہلِ پاکستان کو اُن کے اصل نصب العین سے دُور لے جا رہی ہے تو پھر انہیں مہنگائی اور اشیائے صرف کی کمیابی کے بارے میں فکر مند ہونے سے کہیں زیادہ اس بات کی فکر کرنی چاہیے کہ اس ملک کی زمامِ کار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئے جو ہر لحاظ سے بھروسے اور اعتماد کے قابل ہوں اور جن کے افکار واعمال اس امر کی شہادت دیتے ہوں کہ یہ لوگ نہ صرف اسلامی نظام کے قیام کے معاملے میں مخلص ہیں بلکہ اس کے نفاذ کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔

اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام کے سوچنے کا انداز بدلا جائے اور وہ جو اس اُلجھن میں گرفتار ہیں کہ اگر موجودہ قیادت کو مسندِ اقتدار سے ہٹا دیا جائے تو پھر اور کسے اس پر فائز کیا جائے، اس سے اسے نکالا جائے اور اُسے بتایا جائے کہ کوئی فرد یا گروہ خواہ کتنا ہی متحرک، ذہین اور فعال ہو ناگزیر نہیں ہوتا۔ اُسے ضرورت کے تحت مسندِ اقتدار سے ہٹایا بھی جا سکتا ہے اور اس کی جگہ کسی دوسرے اہل تر فرد یا گروہ کو فائز بھی کیا جا سکتا ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو اِس غلط فہمی کا شکار نہ ہونا چاہیے کہ قدرت نے اُسے دائمی اقتدار کا پٹہ لکھ دیا ہے اور اُسے ہٹانا قدرت کے خلاف جنگ آزما ہونا ہے۔

آپکے بچوں کیلئے ایسی کتابیں

جو دِلچسپ بھی ہیں اور خُوبصورت بھی۔
مُفید بھی ہیں اور پاکیزہ سیرت ساز بھی۔

۱	ہماری کتاب قاعدہ	۱-۴۰
۲	" " حصہ اوّل	۱-۱۰
۳	" " حصہ دوم	۱-۵۰
۴	" " حصہ سوم	۱-۵۰
۵	" " " چہارم	۱-۷۵
۶	" " " " پنجم	۳-۷۵
۷	" " " " ششم	۳-۰۰
۸	اخلاقی کہانیاں حصہ اوّل	۱/-
۹	" " " دوم	۱/-
۱۰	" " سوم	۱/-
۱۱	" " چہارم	۱/-
۱۲	نبیوں کے حالات حصہ اوّل	۰۰-۸۰
۱۳	" " " دوم	۱-۴۰
۱۴	نبیوں کے حالات حصہ سوم	۱-۰۰
۱۵	" " " " چہارم	۱-۵۰
۱۶	موتیوں کا ہار حصہ اوّل	۰۰-۸۰
۱۷	" " " " دوم	۰۰-۸۰
۱۸	" " " " سوم	۱-۰۰
۱۹	" " " " چہارم	۱-۴۰
۲۰	اِنسان کی کہانی	۱-۷۵
۲۱	لاسِلکی کی کہانی	۰۰-۸۰
۲۲	پیٹرولیم کی کہانی	۰۰-۷۵
۲۳	باغ والے	۰۰-۸۰
۲۴	غار والے	۰۰-۸۰
۲۵	ہاتھیوں والے	۰۰-۸۰
۲۶	سنیچر والے	۰۰-۸۰

پُورا سیٹ خریدنے پر آپکو ۲۰ فیصد رعایت اور ڈاک خرچ بھی فری۔ آج ہی اپنی فرمائش سے مطلع فرمائیے۔

اِسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ ۱۳-ای شاہ عالم مارکیٹ لاہور مغربی پاکستان
فون ۶۸۳۴۱